پالکی کہکشاں کی
مظہر امام

پالکی کہکشاں کی

مظہر امام

پالکی کہکشاں کی

(تمام غزلیں)

مظہر امام

اشاعت	:	۲۰۰۰ء
قیمت	:	دو سَو روپے
کمپوزنگ	:	نعت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق	:	وِجے گرافکس
شاعر کی تصویر	:	ڈاکٹر آفتاب محسن
طباعت	:	ایم۔ آر۔ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی
شاعر اور ناشر	:	مظہر امام، 176-B پاکٹ-ا، فیز-ا، میور وِہار، دہلی-110091

زیرِ اہتمام
تنویر احمد

ملنے کے پتے:

- نرالی دُنیا پبلی کیشنز، 358-A، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002
- آدرش کتاب گھر 176-B پاکٹ-ا، فیز-ا، میور وِہار، دہلی-110091
- شب خون کتاب گھر، پوسٹ بکس نمبر 13، رانی منڈی، الٰہ آباد - 211003
- انجمن ترقی اردو ہند، اُردو گھر، دین دیال اُپادھیائے مارگ، نئی دہلی - 110002

اپنی شاعری کے

مَیں

کے نام

مری اِک زِندگی تھی میں نے تیرے نام کر ڈالی
تجھے ضِد ہے ترے معیار تک پہنچا نہیں کوئی

جعفر شیرازی

زباں ز نکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

غرفی

غزلیں

(۱)

۱۹۸۹ء—۲۰۰۰ء

(۲)

۱۹۷۶ء-۱۹۸۸ء

(۳)

۱۹۶۱ء-۱۹۷۵ء

(۴)

۱۹۴۳ء-۱۹۶۰ء

آزاد غزل

۱

۱۹۸۹ء—۲۰۰۰ء

○

وہ بے قصور تھا لیکن سزا سے ڈرتا تھا
لکیر دیکھ کے دستِ دعا سے ڈرتا تھا

شریک ہو نہ سکا جشن آرزو میں کبھی
وفورِ رنگ سے، جوشِ حنا سے ڈرتا تھا

زباں کھل نہ سکی اس کی رُوبرو اپنے
رہا خموش کہ گردِ صدا سے ڈرتا تھا

نہیں تھی جرأتِ اظہار کی کمی اس میں
مگر یہی کہ وہ اپنی اَنا سے ڈرتا تھا

اسے عزیز غزالانِ دشت تھے لیکن
وہ باغِ شوق کی آب و ہوا سے ڈرتا تھا

وہ شب گزارتا یادوں کے گرم بستر پر
جو صبح ہوتی تو ٹھنڈی ہوا سے ڈرتا تھا

مزاج اس کا بہت نرم تھا کلی کی طرح
چمن میں جاتا تو بادِ صبا سے ڈرتا تھا

وہ اپنے نقشِ قدم پر فریفتہ تھا بہت
نئے خیال کی آوازِ پا سے ڈرتا تھا

○

سرِ احاطۂ غم رات بھر سنورنا تھا
تری جدائی میں کارِ ہنر بھی کرنا تھا

اُفق قریب تھا ہمت کی سُرخ رُوئی کا
لہو میں ڈوب کے دریا کے پار اُترنا تھا

ہمیں تھی کون سی سجدے کی آرزو تم سے
مگر دُعا میں کبھی ہم کو یاد کرنا تھا

اگر میں برگِ سحر ہوں تو تم کو تھوڑی دیر
مثالِ قطرۂ شبنم یہاں ٹھہرنا تھا

جواب کا تو پتہ تھا ہمیں، مگر پھر بھی
لبِ سوال ملا تھا سوال کرنا تھا

وہ لوگ بسترِ شب پر بکھر گئے کیسے
انھیں تو آئینۂ صبح میں سنورنا تھا

○

نہ واسطہ تھا غموں سے، نہ قہقہوں* سے تھا
بس اِک تعلقِ خاطر عداوتوں سے تھا

وہ اپنے دوست سہی، ہم سفر کہاں ہوتے!
سفر میں ان کا جو رِشتہ تھا، منزلوں سے تھا!

بساط کیا تھی یہاں ہم سے زرد پتّوں کی
تمام جوشِ نمو تازہ دم گلُوں سے تھا

بندھے ہوئے تھے سبھی بے حسی کے رشتوں میں
نہ قُربتوں سے علاقہ، نہ فاصلوں سے تھا

انھیں حریف بھی کہیے تو شرم آتی ہے
مقابلہ جو ہمارا تھا بے دِلوں سے تھا!

* اس غزل میں قافیے کے تحت گیر اصول سے انحراف کیا گیا ہے۔

○

جیسے کسی طوفان کا خدشہ بھی نہیں تھا
کیا لوگ تھے اندیشۂ فردا بھی نہیں تھا

وہ کیسے مسافر تھے کہ بے زادِ سفر تھے
سینے پہ کوئی بارِ تمنّا بھی نہیں تھا

کیوں لوگ مزاروں پہ دُعا مانگ رہے تھے
مجھ پر کسی آسیب کا سایہ بھی نہیں تھا

کس باغِ طلسمات میں گم ہوگئیں آنکھیں
میں نے تری جانب ابھی دیکھا بھی نہیں تھا!

کیوں تازہ ہوا کا کوئی جھونکا نہیں آیا
احساس کے در پر کوئی پردہ بھی نہیں تھا

نشّہ دُرِ گندم کا ہرن ہونے سے پہلے
جنّت سے نکلنا ہے یہ سوچا بھی نہیں تھا

گِرتی ہوئی دیوار کو سب دیکھ رہے تھے
اس شہر میں کچھ اور تماشا بھی نہیں تھا

ناکردہ گناہی کی سزا دے مجھے یارب!
جو کام کیا میں نے وہ اچھّا بھی نہیں تھا

○

تاریخ میں جگہ کا سزاوار میں ہی تھا
یوسف بکے تو مصر کا بازار میں ہی تھا

اب کیا بتاؤں کس نے چرائی متاعِ فکر
احباب محوِ خواب تھے ، بیدار میں ہی تھا

ایسا ہوا کہ میری مزے میں گذر گئی
سب لوگ خوش مزاج تھے ، بیزار میں ہی تھا

میرا لباس دیکھ کے ہنستے رہے سبھی
عریاں کدے میں ایک گنہگار میں ہی تھا

ہر تشنگی سراب سے سیراب ہو گئی
اقرار کے ہجوم میں انکار میں ہی تھا

دیکھا جدھر کسی نے ملائی نہیں نگاہ
محفل میں جیسے محرمِ اسرار میں ہی تھا

ثابت مرا قصور تو ہونا ہی تھا امام!
قائد تھے ہر قدم پہ ، رضا کار میں ہی تھا

○

شمع کی لو تیز اتنی تھی، دُھواں ہونا ہی تھا
فائدے کے کام میں کچھ تو زیاں ہونا ہی تھا

کس کو خوش آتی ہماری چھت کی سایہ افگنی
گھر بنایا تھا تو پھر بے خانماں ہونا ہی تھا

ہم نتیجے کے لیے تا زندگی بیٹھے رہے
یہ کہاں سمجھے کہ پہلے امتحاں ہونا ہی تھا

وادیٔ گُل سے نکلنا ایک مجبوری بھی
شہرِ ناپُرساں میں ہم کو رائگاں ہونا ہی تھا

○

کوئی سُنے نہ سُنے ، عرضِ حال کرتا جا
نہ رُک جواب کی خاطر ، سوال کرتا جا

سمندروں کو ہوا میں اُچھال دے اک بار
تو با ہُنر ہے تو یہ بھی کمال کرتا جا

بدل دے ہجر کی ساعت کو وصل لمحوں میں
بنا کے کام کو آساں محال کرتا جا

تو بے مثال اگر ہے تو مجھ میں ظاہر ہو
مجھے بھی اپنی طرح بے مثال کرتا جا

قریب آ کہ اُجالوں کے ہار پہنا دوں
مجھے اسیرِ شبِ لازوال کرتا تھا

"شکست و فتح نصیبوں سے ہے" ولے اے دل!
ملے ہیں زخم تو خود اندمال کرتا جا

یہیں کہیں ترا ماضی بھی سانس لیتا ہے
گذرنے والے! بس اتنا خیال کرتا جا

ترا ہنر، تری دانائی بددُعا ہے امام!
زوال تیرا مقدّر، کمال کرتا جا

قطعہ

سخن نواز! مرے نکتہ چیں! مرے ناقد!
مجھے شکارِ عتاب و جلال کرتا جا

بہت سے تیر ہیں تیری کماں میں قید اب بھی
مرے لہو سے قبا اپنی لال کرتا جا

مرے زوال پہ کر ثبت آخری تحریر
یہ کارِ نیک بھی اے لازوال! کرتا جا

○

چپکے چپکے یہ کام کرتا جا
کام سب کا تمام کرتا جا

ہم کو بدنام کر زمانے میں
کچھ زمانے میں نام کرتا جا

یاد کی شاہراہ سیمیں پر
اے سمن بر! خرام کرتا جا

اے کہ تیرا مزاج شبنم سا
برگ دل پر قیام کرتا جا

اشک آنکھوں میں لے کے رخصت ہو
میرا مرنا حرام کرتا جا

بستیوں کا اُجڑنا بسنا کیا
بے جھجک قتل عام کرتا جا

داستاں گو! تری کہانی میں
رمز کیا ہے، کلام کرتا جا

چار چھ شعر کام کے کہہ لے
کچھ تو مظہر امام! کرتا جا

○

خوشبو سے بھی ہے برسرِ پیکار، دیکھنا
موسم کے ہاتھ میں نئی تلوار دیکھنا

ہر ارتکابِ شوق سے انکار، دیکھنا
اس کا ذرا سلیقۂ گفتار دیکھنا

زخموں کے پھول اتنے طرح دار تو نہ تھے
اب کے صبا چلی ہے تو رفتار دیکھنا

یہ مشغلہ بھی خوب ہے اے آمدِ خزاں!
اک گُل کو زیرِ سایۂ دیوار دیکھنا

مہتاب نے اُتار دیا ہے لباسِ شب
افسونِ انتظار کے اسرار دیکھنا!

یہ راہِ مستقیم بہت دُور تک نہیں
ہیں موڑ پر غنیم، خبردار! دیکھنا

اپنا ہی فیصلہ تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے
مُڑ مُڑ کے پھر یہ کیوں درو دیوار دیکھنا

اب اس کا وار تجھ پہ بھی خالی نہ جائے گا
میرے لہو میں تر مری تلوار دیکھنا

○

اس کی آنکھوں میں تمنائے سحر رکھ دینا
سینۂ شب میں کسی بات کا ڈر رکھ دینا

آج گذرے گا اسی سمت سے وہ مہر بدن
دل کے رستے میں ذرا چند شجر رکھ دینا

یہ نہ کہنا کہ اندھیرا ہے بہت راہوں میں
اس سے ملنا تو ہتھیلی پہ قمر رکھ دینا

اس کو اشعار سنانا تو کرامات کے ساتھ
اپنے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں اثر رکھ دینا

وارداتیں تو کئی شہر میں گذری ہوں گی
آج اخبار میں میری بھی خبر رکھ دینا

جس ورق پر ہے حدیثِ لب و رُخسار رقم
اس ورق پر کوئی برگِ گُلِ تر رکھ دینا

ایک مہتاب درخشاں ہے سر بام خیال
میری آنکھوں میں بھی نیرنگ نظر رکھ دینا

لالۂ نم سے تراشے وہ کوئی پیکرِ سنگ
دست صنّاع میں اک یہ بھی ہنر رکھ دینا

○

عجائب گھر میں وہ رہتا ہوا سا
خیالی داستاں کہتا ہوا سا

ندی مہتاب کی ٹھہری ہوئی سی
سکوتِ نیم شب بہتا ہوا سا

ہواؤں کی نظر بدلی ہوئی سی
فضاؤں میں لہو بہتا ہوا سا

گراں گوشی فغاں سے بے خبر سی
لبِ مایوس چُپ رہتا ہوا سا

سنانِ شعلہ گوں چلتے ہوئے سے
میں زخمِ بے حسی سہتا ہوا سا

وہی تشنہ لبی ساحل بہ ساحل
یہ دریا بے سبب بہتا ہوا سا!

○

نئی بارش کی رِم جھم میں لباسِ غم تو بدلے گا
وہی رسمِ چمن ہوگی ، مگر موسم تو بدلے گا

وہ زہرِ بادِ صرصر ہو کہ قہرِ شاہِ خاور ہو
کسی صورت مزاجِ نازکِ شبنم تو بدلے گا

مسیحاؤں نے کچھ تازہ دوائیں لا کے رکھی ہیں
نئے زخم آئیں گے اب بھی مگر مرہم تو بدلے گا

کفن ریشم کے مقتولوں کو اب پہنائے جائیں گے
عزا داروں کا طرزِ گریہ و ماتم تو بدلے گا

نئی ساقی گری کا جشنِ فیّاضی مبارک ہو
وہی ہوں گے ایاغ و جام لیکن سَم تو بدلے گا

نئی ناوک زنی ہوگی ، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ جس عالم میں ہم رہتے ہیں، وہ عالم تو بدلے گا

○

عجیب واقعہ تھا اُس کو اپنے گھر لانا
کبھی چراغ اٹھانا ، کبھی قمر لانا

بیانِ عجز میں الفاظِ معتبر لانا
بڑا کمال دُعاؤں میں ہے اثر لانا

بہت ہے آج تمنّا اُڑان بھرنے کی
مرے کٹے ہوئے بازو ، شکستہ پر لانا

تھکے ہوئے ہیں سبھی پائمال راہوں پر
نئے قدم نہ سہی ، تازہ رہ گذر لانا

وہ شوخ رنگ کا شیدا ہے ، یہ خیال رہے
قریب آنا تو خود کو لہو میں تر لانا

○

نہ ہم نوا مرے ذوقِ خرام کا نکلا
یہ راستہ بھی اُسی نرم گام کا نکلا

نئے گلوں کی صدائے شگفت تیز ہوئی
ہوا کے لمس سے رشتہ کلام کا نکلا

مصوّری نہ سہی ، کام آئی بے ہُنری
کوئی بہانہ تو اُن سے سلام کا نکلا

تلاشِ رزق میں نکلے تھے مہرِ صبح لیے
عقب سے پہلا ستارہ بھی شام کا نکلا

یہاں بھی دھوپ چلی آئی بے خیالی کی
یہ سائبانِ تصوّر نہ کام کا نکلا

مصاحبوں کی طرح ہر قدم پہ خار مِلے
مرا سفر تو بڑے اہتمام کا نکلا

وہی شجر، وہی پتّے، وہی ہوا، وہی آگ
کلامِ نو بھی مرا رنگ عام کا نکلا

○

ترا خیال سرِ شام غم سنورتا ہوا
بہت قریب سے گذرا سلام کرتا ہوا

جھجک رہا تھا وہ مجھ سے نظر ملاتے ہوئے
کہ میں بھی تھا اسی خاکے میں رنگ بھرتا ہوا

میں غرق ہونے ہی والا تھا جب، تو اک تنکا
بھنور سے مجھ کو دکھائی دیا اُبھرتا ہوا

ملا وہ "پانچ ستاروں" کی رقص گاہوں میں
زمانے بھر سے پشیمان، خود سے ڈرتا ہوا

مسافتیں ہیں بہت اور سخت راہوں سے
گذر گیا ہے وہ مجھ کو تلاش کرتا ہوا

رقم ہوا نہیں اب تک نصابِ ہم سفری
وہ قافلہ بھی ملا جب تو کوچ کرتا ہوا

عجب طلسم سفر ہے کہ شام مقتل تک
پہنچ گیا ہوں میں ہر موڑ پر ٹھہرتا ہوا

کنارہ تھا، مرے دریا سے کٹ گیا وہ شخص
کہ میں تھا وقت کی سرحد کو پار کرتا ہوا

○

یوں دل کے راستے سے گزرنے لگی ہے شام
خوں کی طرح رگوں میں اُترنے لگی ہے شام

دم آفتاب وقت کا بھرنے لگی ہے شام
جو کام صبح کا ہے وہ کرنے لگی ہے شام

اب تک فراز کوہ سے اُترا نہیں ہے دن
کن وادیوں میں جا کے سنورنے لگی ہے شام

دو چار گام پر ہے مہ شب کی پالکی
لمحوں کی سیڑھیوں سے اُترنے لگی ہے شام

کن مشکلوں سے دن کا سفر طے کیا ہے آج
وعدے سے لیکن اپنے مُکرنے لگی ہے شام

اے طائر نگاہ ! پروں کو سمیٹ لے
ریگ رواں کی طرح بکھرنے لگی ہے شام

کیسا خیال ، کس کا تصوّر ، کہاں کی یاد!
کن بے خیالیوں میں گزرنے لگی ہے شام

○

اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے سماں کیا دیکھیں
موجِ خوں دیکھیں کہ جمتا ہوا دریا دیکھیں

کیا پتہ کل ہمیں سیلاب کہاں لے جائے
آج کچھ دیر تو بارش کا تماشا دیکھیں

چاہنے والے بہت ، ان کے تقاضے بھی بہت
کیا یہی کام ہے اپنا ترا رَستا دیکھیں!

چند لمحے جو میسّر ہیں غنیمت ہیں یہی
تجھ کو دیکھیں کہ ترا وعدۂ فردا دیکھیں!

کھیل دِکھلانے کو بیٹھے ہیں مداری کب سے
ہم جہاں خود ہی تماشا ہوں وہاں کیا دیکھیں

اپنے رَستے میں بچھاتی رہے دُنیا کانٹے
اور ہم دُور سے بیٹھے ہوئے دُنیا دیکھیں!

ہم سے اب اور ہزیمت نہیں اُٹھنے والی
کارِ جاں ختم ہوا، کارِ جہاں کیا دیکھیں

کل سحر ہوگی تو دشمن کا پتہ پوچھیں گے
کم سے کم آج تو ہم تیر کو آتا دیکھیں

اب تو آنکھیں ہیں کہ پتھرائی چلی جاتی ہیں
رخصتِ بزم ہے، شمعوں کا دُھواں کیا دیکھیں

اِک زمانے سے شب و روز کی گردش ہے امام
ہم کو ملتا ہی نہیں وقت کہ لمحہ دیکھیں

○

اس طرف آیا نہ کوئی کارواں
دُور تک ہیں تیز قدموں کے نشاں!

ہم نے تنکے کو بنایا بادباں
کشتیاں سب تھیں بھنور کے درمیاں

میرے دروازے پہ کس کی دستکیں
میری پیشانی پہ کس کی انگلیاں!

تو ہی میرا ماہ بھی، خورشید بھی
تو ہی میرے روز و شب کا رازداں

مل گیا شہرِ تمنّا کا پتہ
طے مگر کیسے کروں یہ ہفت خواں

پیڑ، پودے، پھل، پہاڑی سلسلہ
ایک پگڈنڈی سرِ میداں رواں

بے گیاہ و آب تپتی سرزمیں
اور گدلا بے پرندہ آسماں

کوئی شہزادی نہ جاگی خواب سے
سو گیا راوی سنا کر داستاں

○

ذوقِ جمال ہو بھی تو چہرہ کہاں سے لاؤں
موجیں تو لا چکا ہوں، پہ دریا کہاں سے لاؤں

آبادیاں بہت ہیں ، خرابے بھی کم نہیں
سرگوشیٔ سخن کا شنا سا کہاں سے لاؤں

کیسے دِکھاؤں لذّتِ تقریر کا ہُنر
منبر ہے سربلند ، سہارا کہاں سے لاؤں

اپنے مقابلے ہی کا ملتا نہیں کوئی
جو تجھ سے بھی سوا ہو میں ویسا کہاں سے لاؤں

میں بھی ستم گری کی ادا سے ہوں آشنا
تیرا کمال ، تیرا سلیقہ کہاں سے لاؤں

کوئی نیا مکان بنانے سے میں رہا
اب اے ہوائے تازہ ! دریچہ کہاں سے لاؤں

ملنا تِرا ہوا ہے اب آساں بھی ، سہل بھی
پہلا سا زخمِ وعدۂ فردا کہاں سے لاؤں

طعنے وہی رہیں گے کہ میں 'بے کتاب' ہوں
پیغام لاؤں بھی تو صحیفہ کہاں سے لاؤں

○

کئی سراب ملے تشنگی کے رستے میں
رُکاوٹیں ہیں بہت روشنی کے رستے میں

ہمارا آپ کا سر پھوڑنا مقدّر ہے
صنم کھڑے ہیں ابھی آدمی کے رستے میں

ہے اس کا ساتھ تو لب پر یہی دُعا ہے کہ پھر
نہ آئے اور کوئی زندگی کے رستے میں

وہاں ملا بھی تو اپنا ہی آشنا سا یہ
کھڑے تھے دیر سے ہم روشنی کے رستے میں

نئی ہے فکر ، مگر لفظ تو پرانے ہیں
قدامتیں ہیں وہیں تازگی کے رستے میں

○

خوش خیالی چاہتی ہے رائگاں کوئی نہ ہو
ہو نتیجہ ہی نتیجہ ، امتحاں کوئی نہ ہو

شہر دل کے اُس بھرے بازار میں چلیے ، جہاں
بیچنے والے بہت ہوں اور دُکاں کوئی نہ ہو

وہ بھی دن آئے زمیں سیراب کرنے کے لیے
خیر کی بارش ہو ، لیکن آسماں کوئی نہ ہو

تم نے دیکھی ہے کبھی وہ انجمن میری، جہاں
آہ وزاری ہو بہت ، طرز فغاں کوئی نہ ہو

ہم بھی اک گوشے میں بیٹھے مانگتے ہیں یہ دُعا
جنگ سب لڑتے رہیں اور کامراں کوئی نہ ہو

یہ بھی کیا قُربِ قیامت کی نشانی ہے اماَم!
رہنما ہی رہنما ہوں ، کارواں کوئی نہ ہو

○

ہمیں ہیں وہ کہ جنھیں بام و در سے رغبت تھی
کہ در بدر بھی اگر تھے تو گھر سے رغبت تھی

ہم اپنے حالِ دگرگوں کی اب خبر کیا دیں
خبر یہی ہے کہ اک بے خبر سے رغبت تھی

دُھلی دُھلائی ہوئی زندگی کو کیا معلوم
کہ اک چکور کو داغِ قمر سے رغبت تھی

جبیں پہ خاک ندامت سجائے پھرتے ہیں
کہ رقصِ شعلہ، سرودِ شرر سے رغبت تھی

شکستہ پا ہی نہیں ہم، شکستہ خواب بھی ہیں
کہ قافلے سے، فضائے سفر سے رغبت تھی

اب اور کیا ہے بس اک کاسۂ انا کے سوا
وہ دن، کہ رقصِ گلِ کوزہ گر سے رغبت تھی

طویل ہونے لگا شام عمر کا سایہ
وصالِ مہر، فراقِ شجر سے رغبت تھی

اب ایک منزل آخر کے منتظر ہیں ہم
وہ دن بھی تھے کہ کسی رہ گذر سے رغبت تھی

○

دُلہن سی جو شکل رات کی تھی　　میّت وہ کسی برات کی تھی

تہہ تھی جو سیاہیوں کی دل پر　　دنیا سے تعلّقات کی تھی

کیوں تم نے بڑھا دی شمع کی لو؟　　ہم نے تو سحر کی بات کی تھی

ہم بزم سے کب کے اُٹھ چکے تھے　　تشویش تمھاری ذات کی تھی

کھیلا کیے شان سے بہت ہم　　بازی وہ اگرچہ مات کی تھی

مفہوم اک اک سے پوچھتے ہیں　　کل ہم سے کسی نے بات کی تھی

اب رات سے صبح کر رہے ہیں　　جس طرح سحر سے رات کی تھی

اے جشنِ حنا منانے والو!
ہم نے بھی کبھی حیات کی تھی

○

ہونٹوں پہ درختوں کے مناجات نہیں تھی
کیا دشت میں اس بار تری ذات نہیں تھی

دامن پہ کہیں داغ شناسائی نہیں تھا
ہر چند کہ یہ پہلی ملاقات نہیں تھی

چہرے پہ تبسم کی لکیریں تو وہی تھیں
پہلی سی مگر اب کے مدارات نہیں تھی

یہ عمر کے بادل تھے کہ تنہائی کے سائے
اس بار جو دیکھا اسے وہ بات نہیں تھی

الزام کسے دیں کہ زیاں کار ہمیں تھے
وجہِ غمِ دل گردشِ حالات نہیں تھی

اشکوں کی جھڑی دیکھ کے دھوکا سا ہوا تھا
کچھ اور ہی موسم تھا، وہ برسات نہیں تھی

اِک شہرِ طلسمات ابھی تک ہے نظر میں
ہر سمت اندھیرا تھا، مگر رات نہیں تھی

پھر حوصلۂ جنگ لیے پھرتے ہیں دل میں
گو ہار ہماری تھی، مگر مات نہیں تھی

حمد

برہنگیٔ سخن کو قبا اُسی سے ملی
تہی حجاب نظر کو حیا اُسی سے ملی

شرارِ رنگ کو ذوق نمو اُسی نے دیا
غبارِ شوق کو گُل کی ردا اُسی سے ملی

سحابِ غم کو جو موسم ملا، اُسی سے ملا
نہالِ خواب کو آب و ہوا اُسی سے ملی

جو شب ہوئی تو اُجالوں نے ہاتھ پھیلائے
سیاہ کار کو شمعِ دُعا اُسی سے ملی

عجیب سادہ و پُرکار ہے مزاج اُس کا
مرض اُسی سے ملا تھا ، دوا اُسی سے ملی

اُسی سے سیکھے ہیں انداز دلبری ہم نے
یہ روٹھنے کی انوکھی ادا اُسی سے ملی

فضائے شام بیاباں کی طرح قصرِ خیال
بس ایک عالم ہو تھا ، صدا اُسی سے ملی

اُسی کے اشک میں بھیگے ہوئے ہیں لفظ مرے
مجھے یہ سوز فغاں ، یہ نوا اُسی سے ملی

کسی طرح تو سنبھالو دلِ حزیں کو اثام!
جزا اُسی سے ملے گی ، سزا اُسی سے ملی

○

نئی کونپل، نئے پھولوں کے زمانے آئے
لوگ بھولے ہوئے دن یاد دلانے آئے

قصّۂ دہر کو دلچسپ بنانے آئے
ہم ترے سچ میں ذرا جھوٹ ملانے آئے

میری پہچان کی خاطر سرِ منبر قاتل
دوستوں کو مری تصویر دکھانے آئے

آگیا موسمِ ہجراں تو گُلِ درد کِھلا
وقت بدلا تو ترے غم بھی سُہانے آئے

تجھ پہ الزام نہیں ہے کوئی مشّاطۂ گُل!
ہم بھی آئے تو یہاں رنگ چُرانے آئے

اپنے شعروں سے ملاقات ہوئی جب تو کھُلا
تازہ دم ہو کے کئی لفظ پُرانے آئے

○

ہم ہی ساقی تھے، ہمیں نشّہ تھے، صہبا ہم تھے
ایسی محفل تھی کہ کوئی نہ تھا، تنہا ہم تھے

ٹوٹنے والے کہاں ٹوٹ کے گرتے آخر
ہم ہی تھے خاک بسر، اُن کا سہارا ہم تھے

آج سب ڈھونڈتے پھرتے ہیں تماشا گاہیں
کل ہی کی بات ہے، جس جا تھے، تماشا ہم تھے

ایسی افتاد، کہ سچ بھی نہیں کہتے بنتا
کیا زمانے کو بُرا کہتے، زمانہ ہم تھے

○

آج کی رات کوئی وار نہ خالی جائے
سنگ و آہن سے ہی اک نہر نکالی جائے

جس کو جانا ہے وہاں ، بن کے سوالی جائے
ہاں ، مگر جاتے ہوئے میری دُعا لی جائے

آخرِ شب ہے نکلنے کو ہے نجمِ سحری
تیرے بستر سے تری نیند چرالی جائے

خشک سالی کی گھٹائیں تو برسنے سے رہیں
جوئے کم آب ہی آنکھوں سے بہالی جائے

کوئی قصّہ تو بنے ، کوئی حکایت تو لکھے
اس سلیقے سے تری بات اُچھالی جائے

فیض اس کا ہے اگر عام تو آگے بڑھ کر
اپنے حصّے کی بھی اک بوند اٹھالی جائے

اب تو گرنے کو ہے دیوار محبّت ہی امامؔ!
اس کی تصویر درِ دل سے ہٹالی جائے

○

ہم اعتبار سحر میں وقار سے بھی گئے
وصال یار کہاں کا کہ دار سے بھی گئے

کہاں سے چل کے کہاں آئے قافلے والے
نقوش پا سے بھی، گردو غبار سے بھی گئے

اُڑاتے پھرتے ہیں اپنی انا کی خاک سبھی
بجھی یہ آگ تو رقصِ شرار سے بھی گئے

ہمیں تو خیر نشہ تھا لہو کی گردش کا
نگاہ لطف کے مے کش خمار سے بھی گئے

خزاں کی رات میں خواب بہار کیا کم تھا
سحر ہوئی تو اُمید بہار سے بھی گئے

خیال یار نے پیروں میں ڈال دی زنجیر
کبھی کبھی کی ملاقاتِ یار سے بھی گئے

بہانہ ہاتھ دکھانے کا کچھ ہمیں بھی ملے
جو ہار مان لی اس نے تو وار سے بھی گئے

امام ! شکر کرو قتل گہ میں رہتے ہو
[illegible]ے نہ قتل اگر تو شمار سے بھی گئے

○

شبِ خیال ہے، تارے ہیں جگمگائے ہوئے
ابھی وہ آئے نہیں، لگ رہے ہیں آئے ہوئے

دیارِ ہجر میں کیا جراتِ طلب کرتے
گذر گئے ترے دل سے نظر بچائے ہوئے

پناہ مانگتی ہے اپنے ہی عزیزوں سے
زمیں ہے اہلِ زمیں کا سراغ پائے ہوئے

ہوائے گُل سے بہت شاد تھے کہ یاد آیا
اُسے زمانہ ہوا میرا دل دُکھائے ہوئے

وہ موج موج ہوا، ساحلوں کی رقّاصہ
برہنہ ریت سے گذری بدن چرائے ہوئے

یہ کس حسینۂ شب کی ہیں انگلیاں جن میں
ہیں جگنوؤں کے نگینے سے جھلملائے ہوئے

مغنّیہ! ترے نغموں کی رات بھیگ چلی
جھپک رہی ہے پلک میرا غم جگائے ہوئے

○

مری روداد طولانی بہت ہے
کہ میں نے خاک بھی چھانی بہت ہے

جو آئینوں میں حیرانی بہت ہے
مجھے خود بھی پریشانی بہت ہے

کنارے ہی پہ جاکر ڈوب جائیں
اگر موجوں میں طغیانی بہت ہے

مگر سب تیلیاں جلنے لگی ہیں
قفس میں یوں تو نگرانی بہت ہے

لہو بھی دیکھ اپنے ساحلوں کا
ترے دریاؤں میں پانی بہت ہے

مجھے اب دیکھنا ہے اپنا کل بھی
تری بات آج تک مانی بہت ہے

ادائیں اس کی ہیں شہزادیوں سی
مزاج اپنا بھی سلطانی بہت ہے

○

میرے حریف ہی کو سہی ، چاہتا تو ہے
اب اس کی زندگی میں کوئی تیسرا تو ہے!

مانا گذارتا ہے وہ مصروف زندگی
لیکن کبھی کبھی ہی مجھے سوچتا تو ہے

چھلکی ہوئی ہیں ساعت جاں کی گلابیاں
محفل میں آنسوؤں کی ابھی رت جگا تو ہے

اس کو اُداس دیکھ کے کتنی خوشی ہوئی
میری تمام عمر کا غم آشنا تو ہے

نوک مژہ پہ اس کی ستارہ کبھی کبھی
میرے دھڑکتے دل کی طرح کانپتا تو ہے

سچ ہے کہ تتلیوں سے اسے ہے مناسبت
کم کم ہی برگِ دل پہ مگر بیٹھتا تو ہے

انگڑائیوں سے پھول کی آتی تو ہے صدا
خوشبو کا شوخ و شنگ بدن ٹوٹتا تو ہے

○

یہ کیسے موڑ پر وہ ہم سفر ہے
یہ رستہ اب بہت ہی مختصر ہے

تھکن سوئی ہوئی ہے جانے کب سے
شجر کی گود اب تک بے خبر ہے

دیا دہلیز پر اب بھی ہے روشن
مکینوں سے مگر خالی وہ گھر ہے

خود اپنی ہی طرح ہم تجھ کو چاہیں
ہمارے پاس ایسا بھی ہنر ہے!

ہمارے ہاتھ کیوں رُک سے گئے ہیں
یہ کس کا باغ ہے، کیسا ثمر ہے!!

۲

۱۹۷۶ء-۱۹۸۸ء

○

نہ جانے دل پہ کیا گزری، مگر باہر نہیں بدلا
تمھارے بعد بھی اس شہر کا منظر نہیں بدلا

بدلتے منظرو! خوش ہوں کہ پس منظر تو باقی ہے
ابھی پردہ ہی بدلا ہے، ابھی وہ در نہیں بدلا

رُتوں کے ساتھ دلداری کی رنگت بھی بدلتی ہے
وہ ہر موسم سے گزرا ہے مگر اکثر نہیں بدلا

مِرے سب خواب تاروں کی طرح ٹوٹے، مگر اُس کا
گلُوں کی اوس میں بھیگا ہوا پیکر نہیں بدلا

وہ اب بھی چین سے، آرام ہی کی نیند سوتا ہے
وہ میرے رَت جگوں کے پاس بھی آکر نہیں بدلا

وہ آنکھیں انجمن در انجمن کروٹ بدلتی تھیں
مگر یہ دل کہ تھا تنہائی کا خوگر نہیں بدلا

کسی شاخِ شجر پر اب کوئی پتّہ نہیں لیکن
ہوا کے ہاتھ میں پہلے تھا جو خنجر، نہیں بدلا

نگاہِ جاہ و منصب سامری کا سحر رکھتی ہے
بہت جمشید بدلے ہیں مگر ساغر نہیں بدلا

○

ترے خیال کا شعلہ تھما تھما سا تھا
تمام شہرِ تمنّا بجھا بجھا سا تھا

نہ جانے موسمِ تلوار کس طرح گزرا
مِرے لہو کا شجر تو جھکا جھکا سا تھا

ہمیں بھی نیند نے تھپکی دی، سوگئے تم بھی
تمام حادثۂ شب سُنا سُنا سا تھا

بلائے شام کے سائے تھے اور وادیٔ دل
اگر چہ صبح کا چہرہ دُھلا دُھلا سا تھا

چراغ منزلِ دل پر جلا کے کیا کرتے!
وفا کا قافلہ کب سے رُکا رُکا سا تھا

وہ نام، جس کے لیے زندگی گنوائی گئی
نہ جانے کیا تھا، مگر کچھ بھلا بھلا سا تھا

○

نہ مجھ میں ہی شعلۂ طلب تھا، نہ تم میں جوشِ سپردگی تھا
مجھے بھی احساسِ کمتری تھا، تمھیں بھی احساسِ کمتری تھا

تمھارے رخسار کی چمک تھی، کہ میرے جذبات کی دمک تھی
سجا سجا شب کا پیرہن تھا، دُھلا دُھلا رنگِ روشنی تھا

تھا کوئی کمزور سا وہ لمحہ کہ تم ہماری طرف کھنچے تھے
ہمارے دل ہی کی طرح کاسہ تمھارے دل کا بھی جب تہی تھا

تمھاری قربت کا معجزہ ہے، مجھے نئے بال و پر ملے ہیں
یہ مجھ کو محسوس ہو رہا ہے کہ میں وہی ہوں جو میں کبھی تھا!

کہا تھا یہ دوستوں نے مجھ سے کہ اُس کی رنگت کا کیا بھروسہ
اگرچہ موسم بدل چکا تھا، مگر جو دیکھا تو وہ وہی تھا

○

وہ قریب آئے گا ، ایسا نہ کبھی سوچا تھا
ہاں ، بچھڑ جائے گا ، کچھ کچھ مجھے اندازہ تھا

رات ٹھہرے ہوئے دریا میں بہت ہلچل تھی
میری تنہائی کے ساحل پہ کوئی اُترا تھا

اُس کو دیکھا تو کئی پھول اچانک چمکے
زخم بھولے ہوئے رشتوں کا ترو تازہ تھا

رنگ در رنگ دھنک تھی کہ چھلک آئی تھی
یاد کا شہر ، کہ آئینہ در آئینہ تھا

اب تو شرمندہ ہے دل ، اپنے کیے پر ، لیکن
کیا وہ سچ مچ تری صورت کی طرح سادہ تھا!

دُکھ تو ہوتا ہے ، مگر دُکھ سے مفر کس کو ہے
کیا یہی تھی مِری آواز ، یہی چہرہ تھا؟

○

بھرا ہوا تری یادوں کا جام کتنا تھا!
سحر کے وقت تقاضائے شام کتنا تھا!

رُخِ زوال پہ رنگِ دوام کتنا تھا!
کہ گھٹ کے بھی مِرا ماہِ تمام کتنا تھا!

تھا تیرے ناز کو کتنا مری اَنا کا خیال
مِرا غرور بھی تیرا غلام کتنا تھا!

جو پَو پھٹی تو ہر اک داستاں تمام ہوئی
عجب، کہ ان کے لیے اہتمام کتنا تھا!

انھیں کو یاد کیا جب تو کچھ نہ یاد آیا
وہ لوگ جن کا زمانے میں نام کتنا تھا!

ابھی شجر سے جُدائی کے دن نہ آئے تھے
پکا ہوا تھا وہ پھل، پھر بھی خام کتنا تھا!

وہاں تو کوئی نہ تھا ایک اپنے غم کے سوا
مرے مکاں پہ مگر اژدہام کتنا تھا!

○

بلند بام ہوا کا مکان کتنا تھا!
میں چھو سکا جو اُسے ، سخت جان کتنا تھا!

زمین پاؤں تلے زلزلوں کی زد میں تھی
ہمارے سر پہ مگر آسمان کتنا تھا!

خود اپنے آپ تلک اُس کی نارسائی تھی
وہ نامور تھا ، مگر بے نشان کتنا تھا!

زمانہ بیت چکا ، کیا کہیں ، کہ پہلے پہل
وہ جب ملا تھا تو ہم کو گمان کتنا تھا!

تمام عضوِ بدن چیختا سا لگتا تھا
وہ دیکھنے میں مگر بے زبان کتنا تھا!

تمام لذّتِ کام و دہن اُسی سے تھی
وہ میہماں تھا ، مگر میزبان کتنا تھا!

کرم تھے مجھ پہ کچھ اتنے ، میں سوچتا کیسے
کہ دوسروں پہ بھی وہ مہربان کتنا تھا!

○

میں جانتا ہوں وہ نزدیک و دُور میرا تھا
بچھڑ گیا جو میں اُس سے ، قصور میرا تھا

جو پاؤں آئے تھے گھر تک مِرے ، وہ اُس کے تھے
وہ دل بڑھا تھا جو اُس کے حضور ، میرا تھا

بڑا غرور تھا دونوں کو ہم نوائی پر
نگاہ اُس کی تھی ، لیکن سرور میرا تھا

وہ آنکھ میری تھی ، جو اُس کے سامنے نم تھی
خموش وہ تھا کہ یومِ نشور میرا تھا

کہا یہ سب نے کہ جو وار تھے ، اُسی پر تھے
مگر یہ کیا ، کہ بدن چُور چُور میرا تھا

○

مزہ لمس کا بے زبانی میں تھا　　عجب ذائقہ خوش گمانی میں تھا

مری وسعتوں کو کہاں جانتا　　وہ محو اپنی ہی بے کرانی میں تھا

مٹاتے رہے اوّلیں یاد کو　　کہ جو نقش تھا، نقشِ ثانی میں تھا

بہت دیر تک لوگ ساحل پہ تھے　　سفینہ مرا جب روانی میں تھا

ہمیں سے نہ آداب برتے گئے　　سلیقہ بہت میزبانی میں تھا

مئے کُہنہ میں تھا نشہ در نشہ　　مگر جو مزہ تازہ پانی میں تھا!

ہمیں وہ ہمیں سے جُدا کر گیا　　بڑا ظلم اُس مہربانی میں تھا

سفر میں اچانک سبھی رُک گئے
عجب موڑ اپنی کہانی میں تھا

○

آمادہ رقابت پہ مرا دل ہی نہیں تھا
یا پھر، کوئی اِس بار مقابل ہی نہیں تھا

اِک تیغ انا تھی جسے سب چُوم رہے تھے
اب کے سرِ مقتل کوئی قاتل ہی نہیں تھا

کب ڈوب کے مرنے کی خوشی تھی ہمیں، لیکن
کشتی کو کہاں لاتے کہ ساحل ہی نہیں تھا

یا تھے تری راہوں میں بھی کانٹوں کے بگولے
یا میں سفرِ لُطف کے قابل ہی نہیں تھا

اب کے جو وہ بچھڑا تو کوئی شاخ نہ سُوکھی
اب کے مرے پہلو میں مرا دِل ہی نہیں تھا

کچھ اپنی کہیں رسمِ محبّت کے شناسا
میں تو ہُنرِ شوق میں کامل ہی نہیں تھا

اب نام کسی موڑ پہ آتا نہیں اُن کا
اچّھا ہے، میں اس بھیڑ میں شامل ہی نہیں تھا

○

شُکر یہ تیرا، کہ غم کا حوصلہ رہنے دیا
بے اثر کردی دُعا، دستِ دُعا رہنے دیا

مُنصفی کا شورِ محشر گونجتا رہنے دیا
سب دلیلوں کو سُنا اور فیصلہ رہنے دیا

اے خدا! ممنون ہوں تیرا کہ میرے پھول میں
تُو نے خوشبوئے ہوس، رنگِ وفا رہنے دیا

کچھ اشارے اتنے مُبہم، اتنے واضح، اتنے شوخ
داستاں ساری سُنا دی، مدّعا رہنے دیا

ایک نازِ بے تکلّف میرے تیرے درمیاں
دُوریاں ساری مٹا دیں، فاصلہ رہنے دیا

○

پھر شہر میں آئے ہیں ستم گر تو ہمیں کیا!
سڑکوں پہ ہیں سنّاٹوں کے لشکر تو ہمیں کیا!

ہم نے تو دریچوں پہ سجا رکھّے ہیں پردے
باہر ہے قیامت کا جو منظر تو ہمیں کیا!

خوشبو میں مقیّد ہیں ہمارے گُل و لالہ
کھُلتا ہے کہیں زخم کا دفتر تو ہمیں کیا!

ہم نے تو کبھی جرأتِ پرواز نہیں کی
توڑے گئے یاروں کے جو شہپر تو ہمیں کیا!

دیوار و در و بام ہمارے ہیں منقّش
شہری ہوئے اِس شہر کے بے گھر تو ہمیں کیا!

بنتے نہیں یہ لوگ بھی کیوں شہ کے مصاحب
ڈستے ہیں انھیں جبر کے اژدر تو ہمیں کیا!

○

میں عکس عکس رنگِ بہاراں میں کھو گیا
یہ حادثہ عجیب ہے ، ہونا تھا ، ہو گیا

لمحاتِ بے بصر کے تعاقب میں وہ گیا*
خمدار سیڑھیوں کا اندھیرا تھا ، کھو گیا

جلتی ہوئی سڑک پہ اکیلا رہا سفر
جب برف گر رہی تھی ترا ساتھ ہو گیا

اب دیکھیے کہ فصل ہو کس کے نصیب میں
میں تخمِ خواب رات کی کھیتی میں بو گیا

میں ساحلِ مُراد پہ تھا تیرا منتظر
لہروں کا زور دل کا سفینہ ڈبو گیا

جاگا رہا جو بسترِ شب پر تمام عُمر
وہ کون تھا جو آج سرِ صبح سو گیا

آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے
اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا

اُٹھو ، کہ اب تو صبح ہوئے دیر ہو گئی
وہ داستانِ درد سُنا کر ، سُنو ، گیا

* یہاں صوتی قافیے کو جائز رکھا گیا ہے۔

○

فسونِ حرف لے گیا، طلسم خواب لے گیا
ورق ورق اسی کا تھا، وہی کتاب لے گیا

ابھی نگہ جھکی نہ تھی کہ میں نے ہونٹ رکھ دیے
سوال وہ نہ کر سکا، مگر جواب لے گیا

مجھے پتہ تھا راہ میں چراغ جل نہ پائے گا
وہاں گیا تو اپنے ساتھ ماہتاب لے گیا

فروغِ جسمِ تازہ سے، خمارِ رنگِ غازہ سے
نشہ بہت بڑھا گیا، مگر شراب لے گیا

مری ازل کی تشنگی بجھا گیا وہ نرم دل
نشاطِ آب دے گیا، غمِ سراب لے گیا

تھا دیکھنے میں سادہ رُو، مگر بڑا ذہین تھا
مجھے گناہ گار کر کے وہ ثواب لے گیا

لُٹا گیا وہ گل بدن چمن کے سارے ذائقے
یہاں وہ خار دے گیا، وہاں گلاب لے گیا

○

چاند شاخوں کی مینا سے ڈھلتا ہوا   درد بچّے کی صورت مچلتا ہوا

یاد کی بیل آنکھوں پہ چڑھتی ہوئی   ایک ارماں گلابوں میں پلتا ہوا

جسم کی آگ پر پھول کھلتے ہوئے   ایک گھر تیز بارش میں جلتا ہوا

رات کی شاہزادی بہکتی ہوئی   غنچۂ صبح آنکھوں کو ملتا ہوا

سخت ہوتے ہوئے آبشاروں کے لب   برف کی طرح موسم پگھلتا ہوا

سر پہ تلوار لٹکی ہوئی شام کی   اور مغرب سے سورج نکلتا ہوا

قافلے شہر و صحرا بھٹکتے ہوئے   اِک ستارہ سرِ راہ جلتا ہوا

ایک آندھی مکانوں میں پلتی ہوئی
اِک پرندہ فضا میں سنبھلتا ہوا

○

ہر کھرا اس کسوٹی پہ کھوٹا ہوا
طاق پر رہ گیا اپنا پرکھا ہوا

کس سلیقے سے مہریں لگائی گئیں
لب جو کھولے کسی نے، اچنبھا ہوا

انجمن انجمن ساز در ساز تھا
موسمِ خامشی میں اکیلا ہوا

خون بوئے گئے، جسم کاٹے گئے
بس یہی کام کا ایک سودا ہوا

سُرخ مخمل کی جھالر لٹکتی رہی
بام و دیوار کا رنگ پیلا ہوا

ساحلِ صبح پر کشتیٔ نُور تھی
بادباں کھُل گئے تو اندھیرا ہوا

وقت کس کس کے زخموں کا مرہم بنے
خود ہے اپنے مسائل میں اُلجھا ہوا

۲۶ رجون ۱۹۷۶ء

○

موسم کے بدلنے کا کچھ اندازہ بھی ہوتا
جب گھر ہی بنایا تھا تو دروازہ بھی ہوتا

ہم شعر نمک ریز سناتے سرِ محفل
جو زخم فسردہ تھا، ترو تازہ بھی ہوتا

تم ہوتے تو معراجِ خیالات بھی ہوتی
بکھرے ہوئے الفاظ کا شیرازہ بھی ہوتا

جذبات کی آنکھوں میں چمکتا کوئی شعلہ
احساس کے رخسار پہ کچھ غازہ بھی ہوتا

رقاصۂ دیروز بھی بے پیرہن آتی
دوشیزۂ امکان کا خمیازہ بھی ہوتا

○

وہ اپنے غم سے ہی چھوٹا نہ ہوگا — کبھی اُس نے مجھے سوچا نہ ہوگا

ہمیں منزل بہ منزل جاگنا ہے — پلک جھپکی تو پھر رستا نہ ہوگا

یہ پہلی برف ہے، آنکھوں میں بھرلو — یہ موسم پھر کبھی اُجلا نہ ہوگا

یہ پہلا لمس ہوگا، لمسِ آخر — زمانے آئیں گے، لمحہ نہ ہوگا

کوئی اک شام تو ایسی بھی ہوگی — وہ آجائے گا جب وعدہ نہ ہوگا

جُدا آگے بھی ہوگا بارہا وہ — یہ منظر اس قدر پھیکا نہ ہوگا

مزاجاً وہ نہ اتنا بے وفا تھا — ہمیں نے اُس طرح چاہا نہ ہوگا!

نہ رُکتا وہ، مگر ٹھٹکا تو ہوتا — یقیناً اُس نے پہچانا نہ ہوگا

ہمیشہ خوش گماں رکھا ہے دل نے
یہ آئینہ کبھی سچّا نہ ہوگا

○

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دُنیا کی طرح

چھوڑ کے جاؤ نہ یوں عہدِ گزشتہ کی طرح
بن کے اُمیّد رہو ، وعدۂ فردا کی طرح

تم ہوا ہو تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موجِ مے ہو تو بہاؤ مجھے دریا کی طرح

پاس رہتے ہو تو آتا ہے جُدائی کا خیال
تم مرے دل میں ہو اندیشۂ فردا کی طرح

بیچ میں کچھ تو رہ و رسمِ تکلّف رکھو
اجنبی یوں نہیں ملتے ہیں شنا سا کی طرح

○

دلوں کے رنگ عجب ، رابطہ ہے کتنی دیر!
وہ آشنا ہے ، مگر آشنا ہے کتنی دیر!

نئی ہوا ہے ، کریں مشعلِ ہوس روشن
کہ شمعِ درد ، چراغِ وفا ہے کتنی دیر!

اب آرزو کو تری، بے صدا بھی ہونا ہے
ترے فقیر کے لب پر دُعا ہے کتنی دیر!

اب اس کو سوچتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں
کہ تیرے غم سے تعلق رہا ہے کتنی دیر!

ہے خشک چشمۂ صحرا ، مریض وادی و کوہ
نگار خانۂ آب و ہوا ہے کتنی دیر!

ٹھٹھرتے پھول پہ تصویرِ رنگ و بُو کب تک!
جھلستی شاخ پہ برگِ حِنا ہے کتنی دیر!

○

زندگی کاوشِ باطل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ
تُو ہی اِک عمر کا حاصل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

لوگ ملتے ہیں سرِ راہ ، گزر جاتے ہیں
تُو ہی اِک ہمسفرِ دل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

تُو نے سوچا ہے مجھے ، تُو نے سنوارا ہے مجھے
تُو مِرا ذہن ، مِرا دِل ہے ، مِرا ساتھ نہ چھوڑ

تُو نہ ہو گا تو کہاں جا کے جلوں گا شب بھر
تجھ سے ہی گرمیٔ محفل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

میں کہ بپھرے ہوئے طوفاں میں ہوں لہروں لہروں
تُو کہ آسودۂ ساحل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

اس رفاقت کو سپر اپنی بنا لیں ، جی لیں
شہر کا شہر ہی قاتل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

ایک میں نے ہی اُگائے نہیں خوابوں کے گلاب
تُو بھی اس جُرم میں شامل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

اب کسی راہ پہ جلتے نہیں چاہت کے چراغ
تُو مری آخری منزل ہے ، مرا ساتھ نہ چھوڑ

○

بے منّتِ چراغ ، ذرا دُور تک چلیں
لے کر دلوں کے داغ، ذرا دُور تک چلیں

صحرائے انتظار کے گُم کردہ راہ کا
ڈھونڈیں کوئی سُراغ ، ذرا دُور تک چلیں

شاید اسی طرح سے ملے ، ہم صفیر کے
احسان سے فراغ ، ذرا دُور تک چلیں

اے رشکِ صد گلاب! ہیں کب سے کِھلے ہوئے
تنہائیوں کے باغ ، ذرا دُور تک چلیں

اندھی مسافتوں نے کیا ہے شکستہ پا
اے دل کے شب چراغ! ذرا دُور تک چلیں

○

زندگی بھول گئی اپنا پتہ ، لوٹ چلیں
جس کو آنا تھا، وہ آنے سے رہا، لوٹ چلیں

درمیاں میرے ترے کچھ نہ بچا ، لوَٹ چلیں
غم کا رشتہ تھا وہی ٹوٹ گیا ، لوَٹ چلیں

دل گرفتہ ہے بہت شب کی صدا ، لوَٹ چلیں
دُور تک نامِ خدا ، نامِ خدا ، لوَٹ چلیں

ہم نئے ہوں کہ نہ ہوں ، اتنے پرانے بھی نہیں
اجنبیت کا کریں کس سے گِلا ، لوَٹ چلیں

شب کی دہلیز پہ چمکی نہ کسی پاؤں کی چاپ
روزنِ صبح بھی کھولے نہ کُھلا ، لوَٹ چلیں

اب اسے فتح کہیں یا کہ شکست ، اتنا ہے
کھیل سب ختم ہوا ، ختم ہوا ، لوَٹ چلیں

کل تو دنیا کی نگاہیں بھی بہت تیز نہ تھیں
جانے کیا سوچ کے اُس نے یہ کہا: لوَٹ چلیں

○

یہ تجربہ بھی کروں، یہ بھی غم اُٹھاؤں میں
کہ خود کو یاد رکھوں، اُس کو بھول جاؤں میں!

اُسی سے پوچھ کے دیکھوں وہ میرا ہے کہ نہیں
اب اور کتنا فریب جمال کھاؤں میں!

وہ بے لباس سہی، جامہ زیب کتنا ہے!
مہِ خیال کو پوشاک کیا پہناؤں میں!

وہ پُل کہاں ہے، جو دُنیا سے جوڑتا تھا مجھے!
جو تُو قریب ہو، سب سے قریب آؤں میں!

کبھی تو ہو مرے احساسِ کمتری میں کمی
کبھی تو ہو کہ اُسے کھُل کے یاد آؤں میں!

وہ شخص ہے کہ نسیمِ سحر کا جھونکا ہے
بکھر ہی جاؤں جو اُس کو گلے لگاؤں میں!

اذاں کے بعد دُعا کو جو ہاتھ اُٹھائے وہ
امام! اپنی نمازیں بھی بھول جاؤں میں!

○

حرفِ دل نارسا ہے ترے شہر میں
ہر صدا بے صدا ہے ترے شہر میں

کوئی خوشبو کی جھنکار سُنتا نہیں
کون سا گل کِھلا ہے ترے شہر میں!

کب دھنک سو گئی، کب ستارے بُجھے
کوئی کب سوچتا ہے ترے شہر میں!

اب چناروں پہ بھی آگ کِھلنے لگی
زخم لَو دے رہا ہے ترے شہر میں

جتنے پتّے تھے، سب ہی ہوا دے گئے
کس پہ تکیہ رہا ہے ترے شہر میں

ایک دردِ جدائی کا غم کیا کریں
کس مرض کی دوا ہے، ترے شہر میں!

اب کسی شہر کی چاہ باقی نہیں
دل کچھ ایسا دُکھا ہے ترے شہر میں

○

کاش ! اب اپنی تمنّا کا خدا ہو جاؤں
وہ ہمہ گوش ہے ، بے صوت و صدا ہو جاؤں

اُس سے پہلی سی عنایت کی توقّع نہ رکھوں
اپنے صحراؤں پہ خود برسوں ، گھٹا ہو جاؤں

میں نے اس جنگ میں کیا کھویا، کسی سے نہ کہوں
مرہمِ زخم بنوں ، اپنی دوا ہو جاؤں

اپنی ہی خاک اُڑاتا پھروں ساحل ساحل
تیرے دریاؤں سے گزروں ، تو ہوا ہو جاؤں

کیا لکیریں ہیں کہ آتا ہی نہیں موسمِ قُرب
کیا میں سرتابہ قدم ، دستِ دُعا ہو جاؤں!

تو وہ دولت ، کہ جسے خرچ نہ ہونا آیا
میں ہوں اِک قرض، اگر تجھ سے ادا ہو جاؤں

اِس دوراہے پہ کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے
تجھ سے بچھڑوں، کہ زمانے سے جدا ہو جاؤں

○

وہی دشتِ بَلا ہے اور مَیں ہوں
زمانے کی ہوا ہے اور مَیں ہوں

تجھے اے ہم سفر! کیسے سنبھالوں
پہاڑی راستہ ہے اور مَیں ہوں

سکوتِ کوہ ہے اور سایۂ در
صدائے ماسوا ہے اور مَیں ہوں

مگر شاخوں سے پتّے گِر رہے ہیں
وہی آب و ہوا ہے اور مَیں ہوں

یہ ساری برف گِرنے دو مجھی پر
تپش سب سے سِوا ہے اور مَیں ہوں

کئی دن سے نشیمن خاکِ دل کا
سرِ شاخِ ہوا ہے اور مَیں ہوں

پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہے
زمیں محوِ دُعا ہے اور مَیں ہوں

مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا
زمانہ سر پھرا ہے اور مَیں ہوں

○

ٹوٹی ہوئی دیوار کا سایہ تو نہیں ہوں
میں تیرا ہی بھولا ہوا وعدہ تو نہیں ہوں

گذرا تھا دبے پاؤں جہاں سے تو شب ماہ
میں ہی وہ ترا باغِ تمنّا تو نہیں ہوں!

جس نقش پہ چلنے کی قسم کھاتی ہے دنیا
میں ہی وہ ترا نقشِ کفِ پا تو نہیں ہوں!

اوروں سے مرا نام اُلجھتا ہے تو اُلجھے
شکوہ تجھے کیوں ہو کہ میں تیرا تو نہیں ہوں

کیوں خود کو نہ چاہوں کہ ترا دل تو نہیں میں
کیوں خود کو بھلادوں کہ زمانہ تو نہیں ہوں

تُو میری ضرورت ، مری عادت تو نہیں ہے
مہتابِ زمیں ! میں تِرا ہالہ تو نہیں ہوں

باغوں سے اُڑائی ہوئی خوشبو ہی سہی تُو
میں نکہتِ بے باک کا پردہ تو نہیں ہوں

میں عکسِ گریزاں تو نہیں اپنی انا کا
میں تیرا ہی ٹوٹا ہوا رشتہ تو نہیں ہوں

میں آخری جادو تو نہیں ساحرِ شب کا
سہما ہوا میں صبح کا تارا تو نہیں ہوں

○

اِک جبر کی حد میں ہو، اس حد سے نکل جاؤ
تم زُلف کی صورت ہو، کُھل جاؤ، مچل جاؤ

معنی کی دھنک بن کر الفاظ میں ڈھل جاؤ
تم موم ہو یا شعلہ، جو بھی ہو، پگھل جاؤ

شاید کہ ہوا آئے، لَو دِل کی بڑھا جائے
محرابِ تمنّا پر اِک بار تو جل جاؤ

ایسا نہ ہو یہ دنیا سب راز اُگل ڈالے
میں ہوش اگر کھودوں کچھ تم ہی سنبھل جاؤ

آئے ہیں قریب اب تو یہ تجربہ کر دیکھیں
کچھ میں بھی بدل جاؤں، کچھ تم بھی بدل جاؤ

○

کوئی بے چین ادا رہنے دو　　بادبانوں کو کُھلا رہنے دو

وقت رُکتا ہوا محسوس نہ ہو　　کوئی ہنگامہ بپا رہنے دو

گھر میں باہر کی ہوا بھی آئے　　دل کا دروازہ کُھلا رہنے دو

میری آنکھوں میں لہو رنگ ہیں اشک　　اُس ہتھیلی پہ حنا رہنے دو

بے کراں دشت، پرندے لرزاں　　دُور کی کوئی صدا رہنے دو

کیا پتہ کب کوئی رستہ بھُولے!　　اپنی چوکھٹ پہ دِیا رہنے دو

خواب زندہ تو ہیں آنکھوں میں ابھی　　ڈوبتی شب کی ضیا رہنے دو

آخری پَل بھی غنیمت ہے بہت　　آپ آجاؤ، دُعا رہنے دو

میں نے جب حالِ تمنا پُوچھا　　دل نے چپکے سے کہا: رہنے دو

زخم کس کس کو دکھاؤ گے امام!
جسم پر شوخ قبا رہنے دو

○

زخمِ تازہ کیا دکھاؤں جب مسیحائی نہ ہو
اُس کے گھر جاؤں تو پہلی سی پذیرائی نہ ہو

رائگاں سارا سفر، سب کوہ پیمائی نہ ہو
میرے جذبے کی طرح گہری کہیں کھائی نہ ہو!

جُرمِ نَو عائد نہ ہو، اک تازہ رُسوائی نہ ہو
دیکھ لوُں، دنیا کہیں میرے قریب آئی نہ ہو!

یہ سزا کیا ہے کہ جلنے کے لیے شعلے نہ ہوں
ڈوبنا چاہوں تو دریاؤں میں گہرائی نہ ہو

میں نے اکثر فاتحوں کے ڈوبتے دیکھے ہیں دل
اے خدا! میں ہار بھی جاؤں تو پسپائی نہ ہو

○

تول مجھ کو ، مجھے میزان میں رکھ
میں علامت ہوں، مجھے دھیان میں رکھ

تُند ہوتی ہوئی ہر لحظہ ہوا
اس کو بھی اپنے ہی احسان میں رکھ

شہر اور گاؤں کو شعلوں سے سجا
موسمِ گُل کو بیابان میں رکھ

تیری ہر جنبشِ ابرو پہ نثار
اپنی تلوار کو اب میان میں رکھ

منزلِ آخرِ شہرت کے سفیر!
اپنے آغاز کو بھی دھیان میں رکھ

دُھوپ کو کمرے کی مسند پہ بٹھا
شام کو چپکے سے دالان میں رکھ

صرف تعداد نہ دیواں کی بڑھا
چند اشعار بھی دیوان میں رکھ

۲۶/ جون ۱۹۷۶ء

○

جاگتی آنکھیں لُٹاتی ہیں زر و گوہر ابھی
شہر سے لوَٹے نہیں خوابوں کے سوداگر ابھی

طائرِ لمحات نے کھولے نہیں شہپر ابھی
دُھند میں لپٹا ہوا ہے صبح کا منظر ابھی

دل کے اندر آ نہ جائے ، آگ ہے باہر ابھی
برف زاروں میں نہ جاؤ ، ہیں یہ شعلے تر ابھی

قتل ہوتے جا رہے ہیں نیلے، پیلے، شوخ رنگ
پیش منظر بن نہ جائے ، ہے جو پس منظر ابھی

سانپ کاٹیں گے اُسے اور زہر ہم تک آئے گا
یہ تماشا بھی دکھائے گا وہ بازی گر ابھی

دیکھ لو ، شاید بدل جائے کبھی موسم کا رنگ
اس طرح کھولو نہ اپنے درد کا دفتر ابھی

گر رہے ہیں زرد پتّے پیڑ سے فالج کی طرح
وادیٔ کشمیر ہے بیمار کا بستر ابھی

○

یہ کھیل بھول بھلیاں میں ہم نے کھیلا بھی
تری تلاش بھی کی اور خود کو ڈھونڈا بھی

مِرا نصیب تھی ہموار راستے کی تھکن
مِرا حریف پہاڑوں پہ چڑھ کے اُترا بھی

یہ آرزو تھی کہ یک رنگ ہو کے جی لیتا
مگر وہ آنکھ، جو شیطاں بھی ہے فرشتہ بھی!

سمندروں سے گہر کب کے ہوگئے ناپید
بھنور کے ساتھ میں گہرائیوں میں اُترا بھی!

برہنگی پہ بھی گزرا قبائے زر کا گماں
لباس پر ہوا جزوِ بدن کا دھوکا بھی

گرجنے والے برستے نہیں، یہ سُنتے تھے
گزشتہ رات وہ گرجا بھی اور برسا بھی!

○

تُو ہے گر مجھ سے خفا، خود سے خفا ہوں میَں بھی
مجھ کو پہچان! کہ تیری ہی ادا ہوں میَں بھی

ایک تجھ سے ہی نہیں فصلِ تمنّا شاداب
وہی موسم ہوں، وہی آب و ہَوا ہوں میَں بھی

مجھ کو پانا ہو تو ہر لمحہ طلب کر نہ مجھے
رات کے پچھلے پہر مانگ! دُعا ہوں میَں بھی

ثبت ہوں دستِ خموشی پہ حِنا کی صورت
ناشنیدہ ہی سہی، تیرا کہا ہوں میَں بھی

جانے کس سمت چلوں، کون سے رُخ مُڑ جاؤں
مجھ سے مت مِل، کہ زمانے کی ہوا ہوں میَں بھی

یوں نہ مُرجھا، کہ مجھے خود پہ بھروسہ نہ رہے
پچھلے موسم میں ترے ساتھ کِھلا ہوں میَں بھی

○

ہوا تھی، رنگ تھی، خوشبو تھی، خوابِ فردا تھی
وہ زندگی نہ تھی، زندگی کا حصّہ تھی

بچھڑ کے اُس سے میں اپنی تلاش میں گُم ہوں
وہ نصفِ ذات تھی، ہر سانس کا تقاضا تھی

ہمیں تو چھوڑ گئے دوست ساحلِ غم پر
جو ساتھ تھی دمِ آخر، وہ موجِ دریا تھی

مزہ ملا مجھے اپنے ہی خوں میں تر ہو کر
ترے وجود کی رِم جِھم میں روح تشنہ تھی

جو تُو ملا بھی تو دو پل کا ساتھ تھا تیرا
مِری جبیں پہ مگر کب سے خاکِ دُنیا تھی!

ترا خیال تھا لپٹا ہوا دُھندلکوں میں
سمندروں کا سفر تھا، ہوا برہنہ تھی

○

یہ سرابِ جسم و جاں ہی تو اُٹھا لے جائے گی
زندگی ہم سے خفا ہو گی تو کیا لے جائے گی!

بُھول جائیں گے تجھے اِک روز تیرے غمگسار
وقت کی آندھی ترا غم بھی اُڑا لے جائے گی

کیا پتہ تھا ایک دن تصویر بن جائیں گے ہم
خامشی چپکے سے آئے گی، صدا لے جائے گی

آج بھی جلتے ہیں آنکھوں میں تصوّر کے دیے
تم تو کہتے تھے کہ سب اندھی ہوا لے جائے گی!

○

رَوندی ہوئی زمیں تھی، نئے رہ گزر بھی تھے
وہ تھے تو اپنے ساتھ نقوشِ سفر بھی تھے

آئے ہیں ہم، تو لائے ہیں یادوں کے سائباں
سنتے ہیں اس دیار میں یاروں کے گھر بھی تھے

ہم کو مِلا تو سایۂ ابرِ سیہ ملا
ورنہ اس آسمان پہ شمس و قمر بھی تھے

اصرار تھا کہ ذکر ہماری طرف سے ہو
ورنہ ہمارے حال سے وہ باخبر بھی تھے

کل کوئی اور کیا ملا، ایسا لگا کہ — تم
برسوں کی راکھ تھی، مگر اُس میں شرر بھی تھے

○

بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے
دُنیا بہت اُداس تھی، جب ہم اُداس تھے

اک خوش ادا کے قُرب سے روشن تھیں لذّتیں
لیکن وہ وسوسے جو مرے آس پاس تھے!

یہ راہِ خار و سنگ مرا انتخاب تھی
جو مرحلے بھی آئے، وہ حسبِ قیاس تھے

دنیا تھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

○

ہاتھ اُٹھتے ہی کٹا ، چلیے ، یہاں سے چلیے
کیا دُعا ، کیسی دُعا ، چلیے ، یہاں سے چلیے

باز ہے کوئی دریچہ ، نہ کوئی دَر ہے کھُلا
کوئی جلوہ نہ ادا ، چلیے ، یہاں سے چلیے

اُس کے گھر پر بھی وہی شہرِ خموشاں کا سماں
کوئی آہٹ ، نہ صدا ، چلیے ، یہاں سے چلیے

خواب ، خوشبوئے طلب ، رنگِ ہوس ، نازِ وفا
سارا سرمایہ گیا ، چلیے ، یہاں سے چلیے

کوئی سایہ ، نہ شجر ، کوئی تمنا ، نہ اُمنگ
اُڑ گئی سر سے ردا ، چلیئے ، یہاں سے چلیئے

اب تو دنیا ہے ، نہ دیں ، کوئی عقیدہ ، نہ یقیں
کوئی اچھا نہ بُرا ، چلیئے ، یہاں سے چلیئے

پاؤں کے نیچے زمیں اب کسی محور پہ نہیں
آسماں ٹوٹ گرا ، چلیئے ، یہاں سے چلیئے

اس چکاچوند میں سِکّوں کی پرکھ کیا ہوگی
کوئی کھوٹا نہ کھرا ، چلیئے ، یہاں سے چلیئے

خود کو کس طرح بچائیں ، کہ بہت دیر سے ہے
تاک میں خلقِ خدا ، چلیئے ، یہاں سے چلیئے

دوستوں ہی کے قبیلے میں یہ کُہرام نہیں
دشمنوں نے بھی کہا: چلیئے ، یہاں سے چلیئے

○

نگاہ و دل کے پاس ہو ، وہ میرا آشنا رہے
ہوس ہے یا کہ عشق ہے ، یہ کون سوچتا رہے!

وہ میرا جب نہ ہو سکا تو پھر یہی سزا رہے
کسی کو پیار جب کروں، وہ چھپ کے دیکھتا رہے

اسے مَنا تو لوں مگر یہ سلسلہ بھی کیا رہے!
الگ ہے اس کا ذائقہ کہ وہ کھنچا کھنچا رہے

مشامِ جاں پہ خوشبوؤں کی جب پھوار ہی نہ ہو
ہزار بات بات میں وہ پھول ٹانکتا رہے!

شگفتنِ جمال کو حجابِ لمس چاہیے
فصیلِ شب کی اوٹ میں چراغ یہ جلا رہے

نہ اتنی دُور جایئے کہ لوگ پوچھنے لگیں
کسی کو دل کی کیا خبر ، یہ ہاتھ تو ملا رہے

○

اُس کو یہ ضد ہے کہ رہ جائے بدن، سر نہ رہے
گھومتی جائے زمیں اور کوئی محور نہ رہے

اُس نے ہمّت جو بڑھائی بھی تو رکھّا یہ لحاظ
کوئی بُزدل نہ بنے، کوئی دلاور نہ رہے

اُس نے اِس طرح اُتاری مرے غم کی تصویر
رنگ محفوظ تو رہ جائیں پہ منظر نہ رہے

اُس نے کس ناز سے بخشی ہے مجھے جائے پناہ
یوں کہ دیوار سلامت ہو، مگر گھر نہ رہے

اب کے آندھی بھی چلی جب تو سلیقے سے چلی
یوں، کہ رہ جائے شجر، شاخِ ثمرور نہ رہے

اب یہ سازش ہے کہ لکھتے نہ کوئی قصّہ دل
لفظ رہ جائیں، مگر کوئی سخن ور نہ رہے

○

تجھے بھی جانچتے، اپنا بھی امتحاں کرتے
کہیں چراغ جلاتے، کہیں دُھواں کرتے

کئی تھے جلوۂ نایاب تجھ سے پہلے بھی
کس آسرے پہ تِرا نقش جاوداں کرتے

سفینہ ڈوب رہا تھا تو کیوں نہ یاد آیا
تری طلب، ترے ارماں کو بادباں کرتے

محبّتیں بھی تری ہیں، شکایتیں بھی تری
یقین تجھ پہ نہ ہوتا تو کیوں گماں کرتے!

ہوا تھی تیز، جلاتے رہے دِلوں میں چراغ
کٹی ہے عمر، لہو اپنا رائگاں کرتے

وہ بے جہت کا سفر تھا، سوادِ شام نہ صبح
کہاں پہ رُکتے، کہاں یادِ رفتگاں کرتے!

دیارِ خواب میں ٹھہرے، حصارِ گُل میں رہے
مگر یہ غم ہی رہا، خود کو شادماں کرتے!

○

اُسے حال سے با خبر کیجیے
مگر خود کو بھی معتبر کیجیے

کئی زلزلے آج آنے کو ہیں
تماشائے زیر و زبر کیجیے

حِنا اب درختوں پہ اُگتی نہیں
مرے خون میں ہاتھ تر کیجیے

بہت دُور تک ریت ہی ریت ہے
ذرا دعوتِ چشمِ تر کیجیے

کبھی تو ندامت کا احساس ہو
تقاضا سرِ رہ گزر کیجیے

کہیں بھی اُتر جایئے راہ میں
سفر کو بہت مختصر کیجیے

جُدائی کے دن ہیں، غزل ہی سہی
یہی ایک کارِ ہُنر کیجیے

○

اُس سے ملے نہ تھے تو زمانے سے کب مِلے
جو لوگ بھی ملے وہ اُسی کے سبب مِلے

بس مَیں! شکست وفتح مرا مسئلہ نہ تھا
یوں تو اسی محاذ پہ جتنے تھے، سب مِلے

میری گزارشوں سے تو ہوگا ہی نرم دل
لیکن مزہ تو جب ہے کہ وہ بے طلب مِلے

اُس کا ہی ایک رنگ ہر اک سے جُدا نہ تھا
اس راستے میں سارے مناظر عجب مِلے

کل وہ ملا تھا دشت میں یوں مجھ سے ٹوٹ کر
جیسے ہوائے درد سے شاخِ طرب مِلے

لیکن وہ فاصلہ جو اَنا سے اَنا میں تھا!
یوں تو بدن بدن سے ملا، لب سے لب مِلے

ہم تھے کہ آنسوؤں کے سفر پر رواں رہے
ورنہ بہت سے غم ہمیں ساغر بلب مِلے

میں بادشاہِ سلطنتِ خواب ہوں امامؔ!
مجھ سے کنیزِ غم جو ملے، باادب مِلے

○

زلزلے سب دل کے اندر ہوگئے
حادثے رومان پرور ہوگئے

کشتیوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں
جتنے صحرا تھے، سمندر ہوگئے

دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ
اب کے کیا گزری کہ پتّھر ہوگئے

وہ نگاہیں کیا پھریں ہم سے، کہ ہم
اپنی ہی آنکھوں میں کم تر ہوگئے

تم، کہ ہر دل میں تمھارا گھر ہوا
ہم، کہ اپنے گھر میں بے گھر ہوگئے

○

دُنیا کا یہ اعزاز ، یہ انعام بہت ہے
مجھ پر ترے اکرام کا الزام بہت ہے

اس عُمر میں یہ موڑ — اچانک یہ ملاقات!
خوش گام ابھی گردشِ ایّام بہت ہے

بجھتی ہوئی صبحیں ہوں کہ جلتی ہوئی راتیں
تجھ سے یہ ملاقات سرِ شام بہت ہے

میں مرحمتِ خاص کا خواہاں بھی نہیں ہوں
میرے لیے تیری نگہِ عام بہت ہے

کم یاب کیا ہے اُسے بازارِ طلب نے
ہم تھے ، تو وہ ارزاں تھا ، پر اب دام بہت ہے

اُس گھر کی بدولت مرے شعروں کو ہے شہرت
وہ گھر ، کہ جو اس شہر میں بدنام بہت ہے

حمد

تِرا ہی بحر ، سفینہ رواں بھی تیرا ہے
بھنور بھی تیرے ہیں اور بادباں بھی تیرا ہے

ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری؟
چراغ بھی ہیں تِرے اور دُھواں بھی تیرا ہے

مجھے تو نذر بھی کرنے کو کچھ نہیں اپنا
جبیں کی خاک تِری، آستاں بھی تیرا ہے

نقوشِ پا کو اُٹھائے کہاں کہاں جاؤں!
کہ گردِ رہ بھی تری، کارواں بھی تیرا ہے

دیا ہے کیوں مجھے لَوح و قلم کا بارِ گراں؟
کہ گردشیں بھی تری، آسماں بھی تیرا ہے

بس اِک کشاکشِ بے نام اور میں بے بس
نتیجہ بھی ہے تِرا، امتحاں بھی تیرا ہے

میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھائے چلوں؟
فنا بھی تیری ہے، نام و نشاں بھی تیرا ہے

○

تم نے شبِ ہجراں کی مجھ کو جو دعا دی ہے
میں نے بھی چراغوں کی لَو اور بڑھا دی ہے

شبنم ہو، کہ موتی ہو، تارا ہو، کہ آنسو ہو
میں نے ترے رستے میں ہر چیز سجا دی ہے

زندانِ جدائی میں خوشبو کی صدا آئے
میں نے تری یادوں کی زنجیر ہلا دی ہے

کشمیر کی غزلوں پر احسان اُسی کا ہے
لفظوں کو قبا دی ہے، ہونٹوں کو نوا دی ہے

○

اب کیا یہ دُھواں سا اُٹھ رہا ہے — وہ شہر تو کب کا جل چکا ہے!

تلخابِ جہاں کہ آتشِ جاں — سب ہجر کا تیرے ذائقہ ہے

شاید کبھی غم پلٹ بھی آئے — تنہا مجھے چھوڑ کر گیا ہے

تم سے تو اُمید ہی کہاں تھی — موسم بھی نظر بدل رہا ہے

برسوں سے چِتا میں جل رہا ہوں — لمحے کے گُناہ کی سزا ہے

یہ خواب بھی میری شب سے لے لو — دن کو مِرے پاس کیا رہا ہے!

میری ہی طرح گِنو ستارے — تم نے یہ مزہ کہاں چکھا ہے!

میں تیرا ہی ہو کے رہ گیا ہوں — ورنہ یہ جہاں بھی کیا بُرا ہے!

خوشبو سے کہو اِدھر بھی آئے
سُنتے ہیں گلاب کِھل چُکا ہے

○

پسِ غبارِ طلب، رات ڈھلتی رہتی ہے
نشے میں چُور، پگھلتی، مچلتی رہتی ہے

خبر یہی ہے کہ آغوشِ ہجر میں پہروں
تمھاری یاد بھی پہلو بدلتی رہتی ہے

یہ میں نے دیکھا ہے اکثر چھٹی پُرانی حیات
سرِ دریچۂ شب ہاتھ مَلتی رہتی ہے

قفس سے ہم بھی نکلنے کو کب سے ہیں بیتاب
مگر وہ ساعتِ آخر جو ٹلتی رہتی ہے!

وہ رنگ، رنگِ بہاراں ہے، کِھلتا رہتا ہے
وہ شاخ، شاخِ ثمرور ہے، پھلتی رہتی ہے

ہے ایک کارِ زیاں شہر شہر دربدری
مگر یہی کہ طبیعت بہلتی رہتی ہے

○

وہ میہمان مرا، میزبان کس کا ہے!
اگر وہ سچ ہے مرا، پھر گمان کس کا ہے!

ہم ایسے دھیان میں گم تھے کہ دھیان ہی نہ رہا
یہ پوچھتی رہی دُنیا کہ دھیان کس کا ہے!

کھڑا ہوا ہوں یہاں ایک پاؤں پر کب سے
یہ سائبان مرا ہے، مکان کس کا ہے!

سُنا ہے یہ کہ یہاں تھا طلسم خانۂ رنگ
زمیں پہ مٹتا ہوا سا نشان کس کا ہے!

رفیقِ موجِ بلا! اب ہوا سے بچنا کیا؟
سفینہ تیز سہی، بادبان کس کا ہے!

وہ میرِ وقت نہیں، غالبِ زماں بھی نہیں
ترا امام مگر ہم زبان کس کا ہے!

○

خواہشِ سُود نہیں ہے تو زیاں بھی کم ہے
روشنی کم ہے تو شمعوں میں دُھواں بھی کم ہے

ایسا لگتا ہے کہ آنسو بھی ہیں تھمنے والے
دل سے آتی ہوئی آوازِ فغاں بھی کم ہے

اپنے جو خواب ہیں، سب اُس پہ نچھاور کردیں
وہ تکلّف بھی نہیں، عجزِ بیاں بھی کم ہے

چوُم لیں زینۂ خلوت پہ اُسے آج کی شام
خوفِ دل ہی نہیں، اندیشۂ جاں بھی کم ہے

بیٹھیں کچھ دیر تری سُرمئی یادوں کے تلے
شُکر ہے آج ذرا کارِ جہاں بھی کم ہے

یوں ہے سرشار ترے قُرب کی لذّت سے خیال
شوقِ مئے بھی، ہوسِ لالہ رُخاں بھی کم ہے

تجھ کو پانے کے لیے، اُس کو بُھلانے کے لیے
ارضِ کشمیر کی وادئ جناں بھی کم ہے

○

تاروں سے بھری راہ گزر لے کے گئی ہے
یہ صبح چراغوں کا نگر لے کے گئی ہے

تم کو تو پتہ ہوگا کہ ہمراہ تمھیں تھے
دُنیا مِرے خوابوں کو کدھر لے کے گئی ہے

پیاسے تھے تو پانی کو پُکارا تھا ہمیں نے
ندی اِدھر آئی ہے تو گھر لے کے گئی ہے

اِک منزلِ بے مقصد و بے نام کی خواہش
کانٹوں کی سواری پہ سفر لے کے گئی ہے

بے بال و پری اب بھی سرِ دشت ہے محفوظ
آندھی تو فقط برگ و ثمر لے کے گئی ہے

شاید کہ اب آئے تِری قُربت کی نئی فصل
اِس بار دُعا بابِ اثر لے کے گئی ہے

چمکے گا ابھی زیورِ شہزادیٔ مہتاب
اُس تک وہ مرے شب کی خبر لے کے گئی ہے

○

ہر ایک شخص کا چہرہ اُداس لگتا ہے
یہ شہر میرا طبیعت شناس لگتا ہے

کھِلا ہو باغ میں جیسے کوئی سفید گلاب
وہ سادہ رنگ ، نگاہوں کو خاص لگتا ہے

سپردگی کا نشہ بھی عجیب نشہ ہے
وہ سر سے پاؤں تلک التماس لگتا ہے

ہوا میں خوشبوئے موسم کہیں سوا تو نہیں!
وہ پاس ہے ، یہ بعید از قیاس لگتا ہے

○

دِلوں کے رنگ نہ ملتے ہوں، جب بھی ہوتا ہے
یہ کارِ شوق کبھی بے سبب بھی ہوتا ہے

تمھاری یاد میں پیتے ہیں لوگ آنسو بھی
تمھارے نام پہ جشنِ طرب بھی ہوتا ہے

بدلتے رہتے ہیں معنی پُرانے لفظوں کے
ہماری بے ادبی میں ادب بھی ہوتا ہے

بہت سے لوگ ہیں، ملتے بچھڑتے رہتے ہیں
یہ کام پہلے بھی ہوتا تھا، اب بھی ہوتا ہے

۳

۱۹۶۱ء-۱۹۷۵ء

○

ہے بھرے درختوں کے باوجود بن تنہا
روز و شب کے ہنگامے ، پھر بھی انجمن تنہا

رت جگوں کے وہ ساتھی کس جہاں میں بستے ہیں
کیا ہمیں تک آئے گی صبح کی کرن تنہا

رہ گئیں کہاں پیچھے گیسوؤں کی برساتیں؟
میرے گھر تک آئی ہے بوئے یاسمن تنہا

وہ تو خیر ، یوں کہیے ، ذوقِ حُسن ہمدم تھا
جوئے شیر کیا لاتا عزمِ کوہکن تنہا!

ہائے یہ شبِ وعدہ ، دل کا حال کیا کہیے
حجلۂ عروسی میں جس طرح دُلہن تنہا

اس اُداس جنگل میں کون منتظر ہو گا
نصف شب کو نکلی ہے چاند کی کرن تنہا

جتنے اہل فن ہیں اب محفلوں کی زینت ہیں
اپنی خلوت غم میں رہ گیا ہے فن تنہا

○

یہ کیسے دَور کا سقراط بن کے جینا تھا
بجائے زہر، مجھے گالیوں کو پینا تھا

وہاں تھی تُندیٔ صہبا، یہاں شکستِ وجود
یہ سنگِ صبح ہے، وہ شب کا آبگینہ تھا

چھُپی تھی موج کی بانہوں میں رُوحِ تشنہ لبی
چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

اُکھاڑ لے گئے سایوں سے کھیلنے والے
ہزاروں سال کا گاڑا ہوا دفینہ تھا

لبِ سکوت سے بوسہ چرا لیا تھا جہاں
نگارخانۂ آواز ہی کا زینہ تھا

○

میں نے پیمانِ وفا آپ سے باندھا کب تھا
مجھ کو خود عمرِ گریزاں پہ بھروسا کب تھا!

وہ کہ خوشبو تھا رہا اپنے چمن تک محدود
دل کی دیوار سے اس نے مجھے جھانکا کب تھا!

اپنا ہی پیکر خستہ تھا ، ہراساں ، لرزاں
جس کو میں سایہ سمجھتا تھا ، وہ سایہ کب تھا

کوئی جھونکا تھا درِ دل کو جگانے والا
میں نے زنجیر تمنّا کو ہلایا کب تھا

ہر دوراہے پہ وہی بھیڑ تھی تنہائی کی
میں بھی اس بھیڑ میں شامل تھا، اکیلا کب تھا!

عمر بھر کی ہے اآم ! اپنی پرستش تم نے
خود کو جس طرح سے چاہا اُسے چاہا کب تھا

○

کوئی نگاہ و دل کا خریدار ہی نہ تھا
ہم نے دکاں سجائی تو بازار ہی نہ تھا

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور، شوق کو، آزار ہی نہ تھا

نایاب تھے گہر ہی کی مانند خشت و سنگ
یا اس نگر میں کوئی گنہگار ہی نہ تھا

سب اپنے اپنے غم میں کچھ اس طرح محو تھے
جیسے کسی کا مجھ سے سروکار ہی نہ تھا

بس اِک متاعِ جاں تھی لُٹانے کو ان کے پاس
میری طرح وہاں کوئی دل دار ہی نہ تھا!

وہ کیا بدلتے 'حُسن کا معیار' اے امام!
اہلِ ہوس کے سامنے معیار ہی نہ تھا

○

میں نے موت کا چہرا دیکھا
کتنا بھیانک ، کتنا پیارا

فُٹ پاتھوں پر نیند پڑی تھی
سورج سر پر آن کھڑا تھا

سایہ سایہ آگ لگی تھی
پتّہ پتّہ ہانپ رہا تھا

اک انجانی لاش کے آگے
پاگل کُتّا بھونک رہا تھا

بازاروں میں بھیڑ ہوا تھی
دہلی کا دربار سجا تھا

ظاہر و باطن دونوں یکساں
منہ بھی کالا ، دل بھی کالا

اور حقیقت کیا خوابوں کی
دن کے زہر کا شب کو نشّہ

○

سانحہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اُتر جاؤں گا

اپنے ٹوٹے ہوئے خواب کی کِرچیاں
تیری آسودہ آنکھوں میں بھر جاؤں گا

روشنی کے سفینے بلاتے رہیں
ساحلِ شب سے ہو کر گذر جاؤں گا

اجنبی وادیاں — کوئی منزل، نہ گھر
راستے میں کہیں بھی اُتر جاؤں گا

میرے دُشمن کے دل میں جو برسوں سے ہے
وہ خلا بھی میں اک روز بھر جاؤں گا

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

○

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ گر آیا، تو کیا لے جائے گا

مانگنے والے ! ذرا اپنی لکیریں بھی تو دیکھ
ساری تاثیرِ دُعا دستِ دُعا لے جائے گا

اُٹھ گئی ہے دوسروں کی راہ پر چلنے کی رسم
ہر مسافر اپنا اپنا نقشِ پا لے جائے گا

خود فراموشی بھی میری خود شناسی ہے، کہ وہ
میرے پاس آیا تو اپنا بھی پتہ لے جائے گا

میری آنکھوں میں گذرتے موسموں کا عکس ہے
سیلِ آئندہ نئی رُت بھی بہا لے جائے گا

اس طرح گرنے نہ دو یادوں کی شبنم دیر تک
یہ خُنک سایہ بھی کوئی دل جلا لے جائے گا

یہ نہ سوچا تھا کہ یہ بھی ہو رہے گا ایک دن
چھین کر تیری طلب دستِ انا لے جائے گا

دائرہ در دائرہ بڑھنے لگا لمحوں کا شور
گنبدِ افکار سے میری صدا لے جائے گا

اور کیا رکھا ہے میرے پاس لے جانے کو اب
میرا قاتل آئے گا، میری دُعا لے جائے گا

○

سچ کہہ لو کہ یہ وقت مکرّر نہ ملے گا
یہ دل کی عدالت ہے، یہ محشر نہ ملے گا

اشکوں کی ردا اوڑھ کے اشجار کھڑے ہیں
اب چاند بھی نکلا تو وہ منظر نہ ملے گا

جاتے ہو تو بچّوں کو بھی ساتھ اپنے لیے جاؤ
جب لوٹ کے آؤ گے۔ تو یہ گھر نہ ملے گا

کیا بامِ فلک بوس، کہ اس آتش و خوں میں
دیوار ملے بھی تو کوئی دَر نہ ملے گا

باہر تو ملیں گی تمھیں ڈستی ہوئی آنکھیں
لیکن کوئی ان کمروں کے اندر نہ ملے گا

○

خون اوڑھے ہوئے ہر گھر کا سراپا نکلا
آپ کے شہر کا انداز نرالا نکلا

چھوُ کے اک شخص کو پرکھا تو ملمّع* نکلا
اُس کو میں کیسا سمجھتا تھا ، وہ کیسا نکلا!

روح ویران ملی ، رنگ پریدہ نکلا
اس کو نزدیک سے دیکھا تو زمانہ نکلا

سچ کے صحرا میں اُنھیں ڈھونڈ کے تھک ہار گئے
جھوٹ کے شہر میں یاروں کا بسیرا نکلا

* یہاں صوتی قافیے کو جائز رکھا گیا ہے۔

خوش ہوا اے دھوپ کے نیزوں سے جُھلنے والو!
چاند کے دوش پہ سورج کا جنازہ نکلا

جس سے کترا کے نکلتے رہے برسوں سرِ راہ
اُس سے کل ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا

کہیں صحرا میں بھی ڈس لے نہ ہمیں سیرابی
ریت کے بطن سے پُھنکارتا دریا نکلا

نرم رَو تھا، تو سبھی راہ سے منہ موڑ گئے
سنگ اُٹھایا، تو مرے ساتھ زمانہ نکلا

وادیاں، لفظ و معانی کی، تہِ آب ہوئیں
کن پہاڑوں سے خیالات کا جھرنا نکلا!

○

سوچنے والے ! اگر تُو مرا اپنا ہوتا
تُو نے میری ہی طرح خود کو بھی سوچا ہوتا

میں تو اِس حشرِ تماشا میں خُدا بن کے رہا
تُو بھی اِس بھیڑ میں ہوتا تو اکیلا ہوتا

اب تو یہ غم ہے ، ملاقات ہوئی کیوں تجھ سے
تُو نہ ہوتا تو مرے ساتھ زمانہ ہوتا

اُس کی دہلیز کے سُورج کو اُٹھا لے آتے
اپنی دیوار کا سایہ جو گھنیرا ہوتا

میں بھی اب سوچ رہا ہوں کہ تمھاری ہی طرح
بیچ کر خود کو یہ بازار خریدا ہوتا

○

چوٹ کھائے ہوئے سانپوں سے بچایا ہوتا
ہم کو شہرت کے گڑھے میں نہ گِرایا ہوتا

کتنی آنکھیں نگراں ، کتنے دریچے وَا تھے
دو قدم ہم نے کسی سمت بڑھایا ہوتا

دستِ گستاخ کو ہم کوئی سزا دے لیتے
تم نے دامن کا تقدّس تو بچایا ہوتا

دیکھتے ہم بھی ذرا داغِ تصنّع کی چمک
تم نے اخلاق کا چہرہ تو دکھایا ہوتا!

آج ماضی کی کوئی بات بھی آتی نہیں یاد
کاش اِک شخص کو ہم نے نہ بھُلایا ہوتا

جانے وہ کون تھا، کیوں آیا تھا، کیا کہتا تھا
آپ نے اس کا تعارف تو کرایا ہوتا

○

بوجھ الفاظ کا ہونٹوں پہ اُٹھاتے ہو عبث
پنبہ در گوش ہیں سب، حال سناتے ہو عبث

مسخ کر دیں گی تمھیں خود ہی ہوائیں کل کی
اپنی تصویر سے دیوار سجاتے ہو عبث

چھت سے، تپتا ہوا سورج بھی، بہت دور نہیں
روشنی کے لیے تاروں کو بجھاتے ہو عبث

نرخ جب اپنا بڑھانے کا سلیقہ ہی نہیں
ہر نئے شہر میں بازار اگاتے ہو عبث

تم بھی کس نسلِ فرومایہ کے ہو فرد امام!
خود کو جب ڈھا چکے، مینار اٹھاتے ہو عبث

○

ڈھلی ہوئی ہے فضا برگِ نسترن کی طرح
لباسِ درد بھی بے داغ ہے کفن کی طرح

دیارِ خواب میں یہ کون خوش نقاب آیا
زوالِ شب سے جھجکتی ہوئی کرن کی طرح

ہے تیرے لمسِ کفِ پا سے رہ گذر مہتاب
دمک رہی ہے زمیں تیرے پیرہن کی طرح

ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے آیا ہوں
بھرا ہوا ہے مرا دل ترے بدن کی طرح

امامؔ: تم بھی کبھی شعلۂ جگر میں جلو
ہر ایک لفظ پہ ٹوکو نہ اہلِ فن کی طرح

○

جانے کیا بیتنے والا ہے ترے دھاروں پر
زخم طوفانوں کے ہیں آہنی پتواروں پر

یوں بھی ہیں تیری عنایات گنہگاروں پر
رحمتیں بھیج شبِ غم کے عزاداروں پر

اشک ٹپکے جو ترے آتشیں رُخساروں پر
پڑ گئی اوس دہکتے ہوئے انگاروں پر

کون یہ سادہ قبا کوچۂ دل سے گذرا
صبح کی چھوٹ پڑی رات کی دیواروں پر

جانے کب چشمِ بصیرت سے لہو پھوٹ پڑے
ناخنوں کے ہیں نشاں وقت کے رخساروں پر

اپنی تحریر کو پڑھنے ہی سے فرصت نہ ملی
ورنہ لکھا تھا بہت شہر کی دیواروں پر

اپنے ہی فن کے تلے دفن ہے ہر صاحبِ فن
بوجھ بھاری ہے عمارات کا معماروں پر

○

اِس طرح اب سرِ منظر آؤں اپنے سائے کے برابر آؤں

تو جو بانہوں میں جکڑ لے بڑھ کر میں فضاؤں میں بکھر کر آؤں

پیاس تیری بھی اگر بُجھ جائے پی کے میں سات سمندر آؤں

بھُول جاؤں نہ سبق بچپن کا لے کے پھر ہاتھ میں پتّھر آؤں

ہو جہاں تو بھی نشانِ سرِ راہ اُن فضاؤں میں سفر کر آؤں

ٹوٹنے دے یہ حصارِ لمحات راستے بند ہیں، کیوں کر آؤں!

ہاتھ سُوکھے ہوئے پتّوں کے بڑھیں جب سرِ شاخِ ثمرور آؤں

گھر سے گھبراؤں تو نکلوں دمِ صبح شام کو لوٹ کے پھر گھر آؤں

زندگی کیا ہے: مسلسل برداشت
خود کو اب توڑ کے باہر آؤں

○

رنگ کیا دکھاتا ہے خونِ رائگاں دیکھوں
دھار تیز ہے کتنی رکھ کے انگلیاں دیکھوں

ساتھ لے کے آیا ہوں اب اُنھیں کی تلواریں
اِک ذرا یہیں رُک کر رنگِ دُشمناں دیکھوں

شہر اُگنے والا ہے ، سانس رُکنے والی ہے
جنگلوں کے جلنے کا دُور تک سماں دیکھوں!

زندگی کی لہروں میں آگ تلملاتی ہے
کس کی کشتیاں دیکھوں ، کس کا بادباں دیکھوں

دوسروں کا قصّہ بھی اب نیا نہیں لگتا
کون سا ورق اُلٹوں ! کس کی داستاں دیکھوں!

پُرسکون گھر میں بھی کیا وہی ہے ہنگامہ!
اُس طرف سے جب گذروں، بند کھڑکیاں دیکھوں

دُور تک مکینوں کے نقشِ پا نہیں ملتے
کون سا کھنڈر دیکھوں! کون سا مکاں دیکھوں!

اب تو ان مناظر کی شکل ہی نہیں بنتی!
ہوں لہو لہو آنکھیں میں جہاں جہاں دیکھوں

○

صدیوں کے اس ترسے دل کو پیش میں کیا سوغات کروں؟
آج جو تیرے ساتھ ملی ہے، کیسے بسر وہ رات کروں!

جانے وقت کا ضدّی بالک شور مچا کر کب سو جائے
آ، اے غمِ محبوب! میں تجھ سے پچھلے جنم کی بات کروں

شاید اک دن غم کا مسافر نیند کی چوکھٹ تک پہنچے
دریا دریا صبح کروں اور صحرا صحرا رات کروں

سنّاٹے کے گہرے پن میں گُم ہے اپنی بھی آواز
ڈھونڈ کے لاؤں کوئی دُشمن، اس سے دو دو بات کروں

دن کا سورج آگ اُگل کر آخر خود بھی راکھ ہوا
سُوکھی پیاسی رات پہ اپنے سپنوں کی برسات کروں

○

اپنے رِستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ، کہ میں آیا ہوں

کسی سُنسان جزیرے سے پکارو مجھ کو
میں صداؤں کے سمندر میں نکل آیا ہوں

کام آئی ہے وہی چھاؤں، گھنی بھی جو نہ تھی
وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کملایا ہوں

خیریت پوُچھتے ہیں لوگ بڑے طنز کے ساتھ
جُرم بس یہ ہے کہ اِک شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اُس پھول کو دیکھوں، کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اُٹھا لایا ہوں

عصرِ نوَ! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

○

وسعتیں اپنی لیے سمٹی ہوئی دنیا میں ہوں
میں سمندر ہوں، مگر خود پیاس کے صحرا میں ہوں

میں نے ہی ماضی کی تُربت پر جلائے ہیں چراغ
میں مجاور حال کا ہوں، حجرۂ فردا میں ہوں

کور چشموں کے لیے کیا روشنی، کیا تیرگی!
سرمۂ غم ہی سہی، میں دیدۂ بینا میں ہوں

ایک ہی موسم ہے آنکھوں کا، الم ہو یا نشاط
میں مگر مچھ کی طرح احساس کے دریا میں ہوں

بد دُعا کس لمحۂ حاضر کی ہے مجھ پر اماں!
ہوں صدائے عصر، لیکن گنبدِ فردا میں ہوں

○

ایک مدّت سے مرے گھر میں کوئی آیا نہیں
اِن شناساؤں میں کوئی آشنا چہرہ نہیں

میرا حصّہ دُوریاں ، ناکامیاں ، محرومیاں
یہ جہاں ، سب کا جہاں ، میرا نہیں ، میرا نہیں

پُل ہی پُل ، سڑکیں ہی سڑکیں ، کیا کرے ذوقِ جنوں
آج رستے میں کوئی دریا نہیں ، صحرا نہیں

بے محل ہیں انجمن آرائیاں ، تنہائیاں
آدمی کا آدمی سے اب کوئی رِشتہ نہیں

آج کے بوَنے اڑُاتے ہیں ہمالہ کا مذاق
ہاتھ میں پتّھر بہت ہیں، سَر کوئی اُونچا نہیں

وقت کا سورج سوا نیزے پہ کب کا آچکا
آنکھ والوں نے ابھی تک یہ سماں دیکھا نہیں

جس کے نُسخوں سے شفا بیمار دنیا کو ملے
وہ صحیفہ آسماں سے آج تک اُترا نہیں

○

خشک پتّے بھی نہیں ، یاسمنِ تر بھی نہیں
پسِ منظر بھی نہیں ہے کوئی منظر بھی نہیں

آج کے دَور کی تصویر دکھائی دے گی
آکے دیکھو یہ مکاں ، چھت بھی نہیں ، دَر بھی نہیں

بھیک مانگے کہ نہ مانگے ، پہ طلبگار تو ہے
دل ، جو مُفلس بھی نہیں اور تونگر بھی نہیں

کسی تالاب میں لہریں ہی بناتے ، گنتے
وہ تہی دست ہیں ہم ، ہاتھ میں کنکر بھی نہیں

تم پہ یہ وقت پڑا ہو تو بتاؤ یارو!
دل کے اندر بھی نہیں ہے کوئی باہر بھی نہیں

○

وہ حادثہ جسے ہونا تھا وہ ہوا بھی نہیں
چراغِ دل ، کہ جلا بھی نہیں ، بجھا بھی نہیں

خیال پر بھی لگادی گئی ہے مُہر اب کے
کئی دنوں سے مجھے کوئی سوچتا بھی نہیں

بڑا عجیب سفر ہے ، نہ رہروی ، نہ قیام
جو کج قدم ہیں انھیں کوئی ٹوکتا بھی نہیں

جب اُڑ رہا تھا تو بیساکھیوں کے تحفے تھے
جو گِر رہا ہوں تو کوئی سنبھالتا بھی نہیں

یہ کیسے خواب ہیں جن کا نشہ نہیں ٹوٹا
وہ زخم زخم ہے ، لیکن کراہتا بھی نہیں

یہ معرکہ بھی عجب ہے ، بڑا دلیر ہے وہ
کہ فتح یاب نہیں اور ہارتا بھی نہیں!

○

اب لوگ صرف آنکھ سے پہچانتے نہیں
چھو کر جسے نہ دیکھیں اسے مانتے نہیں

اس شہر بے ضمیر کے اعمال روسیاہ
سب پر عیاں ہیں، ایک تمھیں جانتے نہیں

ہے "پردۂ صغیر"* کی اک اک ادا پسند
اس کے سوا کسی کا کہا مانتے نہیں

نشّہ ہے جن کی آنکھ میں میری شراب کا
اب اپنے سامنے مجھے گردانتے نہیں

کچھ اور سلسلہ ہے ہمارا گلوں کے ساتھ
مثلِ نسیم خاک چمن چھانتے نہیں

ہر لمحۂ حیات ہے دُشنام کی طرح
اک ہم، کہ گالیوں کا بُرا مانتے نہیں!

* Small Screen (ٹیلی ویژن)

○

پَل میں سب ختم ہوا، صرف تماشا ہی نہیں
آنکھ موجود ، مگر دیکھنے والا ہی نہیں

روشنی کے لیے اِک عمر سُلگتے گذری
اور اب شمع ملی ہے تو اندھیرا ہی نہیں!

کتنے رَستے تھے جو منزل کی طرف جاتے تھے
پاس پہنچے ہیں جو منزل کے، تو رَستا ہی نہیں!

کشتیٔ شوق رُکے بھی تو کہاں جا کے رُکے
اپنے خوابوں کے سمندر کا کنارا ہی نہیں

آئینہ خانے میں آئے تھے بڑے فخر کے ساتھ
آنکھ نیچی ہے، کہ اپنا کہیں چہرا ہی نہیں

اتنے نزدیک سے ہم تیری صدا کیا سُنتے!
دُور سے تو نے کبھی ہم کو پُکارا ہی نہیں

صبح کے بھُولے تو ہو، شام کو واپس آجاؤ
اور کہہ دو کبھی تم نے مجھے چاہا ہی نہیں

محفلِ جشنِ طرب صبح تلک گرم رہی
خیر خواہوں کو وہاں ہم نے بُلایا ہی نہیں

یوں بھی کہتے تھے غزل ہم تو سرِ شامِ فراق
آج تو خیر ملاقات کا وعدہ ہی نہیں!

کیسے رکھو گے نئے دَور کی بُنیاد اَمام!
تم نے لٹتی ہوئی قدروں کو بچایا ہی نہیں

○

نئے مکاں میں عقیدے کی کوئی جا ہی نہیں
خدا تو ہے پہ کہیں بندۂ خدا ہی نہیں

بھروسہ یوں تو بہت تھا، مگر دُعا کے لیے
جو ہاتھ ہم نے اٹھایا تو وہ اٹھا ہی نہیں

ہر ایک شخص یہاں اپنے آپ میں گم ہے
کسی سے ہاتھ ملانے کا فائدہ ہی نہیں

لہو لہان ہے جو بھی اُدھر سے آیا ہے
مگر یہ میں، کہ جو اُس راہ تک گیا ہی نہیں!

دیارِ خواب ہے، آؤ، یہیں قیام کریں
یہاں سے یوں بھی نکلنے کا راستہ ہی نہیں!

○

رات کو دیر سے وہ آتے ہیں — اپنے ماں باپ کے دُلارے ہیں!

کتنے نازک یہ آب گینے ہیں! — دوست، اللہ کے سنوارے ہیں

کچھ حسینوں نے شاخِ گیسو پر — کیا حسیں گھونسلے بنائے ہیں!

اب بھی تجدیدِ رسم و راہ سہی — آپ تو اب بھی اچھّے خاصے ہیں!

ساتھ چلنا بھی جن کو دو بھر تھا — اب وہی لوگ آگے آگے ہیں

چند مہمل سے شعر بھی کہیے — شاعری کے نئے تقاضے ہیں!

بسترِ مرگ پر ہے اُردو زباں — لوگ عربی قرانؔ* پڑھتے ہیں

ان کی صورت تو دیکھئے مظہرؔ!
شاعری کا یہ ذوق رکھتے ہیں

* تلفظ کی یہ دونوں غلطیاں دانستہ ہیں۔

○

جسم و جاں کے کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں
غم کے پھوڑے دل کے چھالے اک دن پھوٹ ہی جاتے ہیں

میری رقابت میں ہی آخر تم آئے تو منزل تک
راہِ وفا میں ورنہ اکثر ساتھی چھوٹ ہی جاتے ہیں

دل کو پتّھر کرلینے کا ہم نے کچھ فن سیکھا ہے
ایک ذرا سی ٹھیس سے ورنہ شیشے ٹوٹ ہی جاتے ہیں

چاہو تو ہشیار رہو ، ہشیاری سے کیا ہوتا ہے
لُوٹنے والے دل کے نگر کو اکثر لُوٹ ہی جاتے ہیں

○

کم ظرف ہیں، تنقید سے بیزار رہے ہیں
کہنے کو تو یہ لوگ قدح خوار رہے ہیں

کوچے میں رقیبوں کے لیے پھرتے ہیں کشکول
جو محفلِ احباب میں خود دار رہے ہیں

وہ بھی نہ ہوئے رسمِ محبّت سے شناسا
جو لوگ کہ رُسوا سرِ بازار رہے ہیں

جتنی بھی ہو، قیمت تو لگا دیجیے اپنی
ہم جنسِ گراں ہی کے خریدار رہے ہیں

میری ہی طرح کرتے ہیں اِک اِک کی شکایت
جو اپنے ہی خوابوں کے پرستار رہے ہیں

نقّاد ہیں، کرتے ہیں سخن فہمی کا دعویٰ
یہ حضرتِ مظہرؔ کے طرف دار رہے ہیں

○

اس اضطرابِ شوق کی کوئی سزا تو دو
جاگا ہوا ہوں رات کا ، دن میں سُلا تو دو

پھر اتنا شوخ رنگِ ساعت ہو یا نہ ہو
تم سازِ التفات پہ اِک گیت گا تو دو

اُبھرے گا خود ہی قُرب کی لذّت کا ماہتاب
پہلے تم احتیاط کی شمعیں بُجھا تو دو

دونوں کی اُلجھنوں میں ہے اِک ربطِ ناگزیر
اپنا پتہ بھی پاؤ گے ، میرا پتہ تو دو

سنگِ گراں کی طرح کھڑے کیوں ہو دوستو!
منزل کو جانتا ہوں ، مگر راستہ تو دو

تُم تو رجائیت کے پرستار ہو امام!
فردا کی انجمن سے کوئی شمع لا تو دو

○

ہے غم کی رات ، تیز کریں گردشِ سبو
اب کے نچوڑنا ہے کڑے وقت کا لہو

دیکھو یہ اتفّاق ، ملا آج پھر کوئی
بالکل تمھاری طرح ، تمھیں جیسے ہُو بہو

اچھّا ہوا کہ غیر سے سب فیصلے ہوئے
تُم سے بھی بات کرلیں ذرا آج دُو بدو

ہم خود ہی اعتبار کے قابل نہیں رہے
کس مُنہ سے تم کو دوست کہیں ، اور اسے عدو

ہر آئینے سے آنکھ چُراتے ہیں آج ہم
کل تیری جستجو تھی کہ تھی اپنی جستجو!

اپنی ہی چیخ چار طرف سے اُبھر گئی
آواز دوستوں کو لگائی جو کُو بکُو

صدیوں کا خون پی کے بھی اب تک وہی ہے پیاس
دھرتی پکارتی ہے ابھی تک: "لہو! لہو!!"

چیخوں کے اژدہام میں تنہا ہے آدمی
اے زندگی! بتا، کہ کدھر جارہی ہے تو؟

○

میں وہی ہوں کہ نہیں، غور سے دیکھو مجھ کو
مسئلہ جان کے، کچھ دیر تو سوچو مجھ کو

میں نے رگ رگ میں چٹانوں کی شعاعیں بھر لیں
اپنی تنقید کی میزان پہ تولو مجھ کو!

ساحلوں پر مری تصویر بنانے والو!
بیچ دریا میں بھی اک بار اُبھارو مجھ کو

میں ہوں دیوارِ تمنّا سے اُترتی ہوئی دھوپ
اپنی تنہائی کے آنگن میں بٹھالو مجھ کو

اس سے پہلے کہ زمیں آئے بلا لے جائے
توڑ لو شاخِ ثمردار سے یارو! مجھ کو

میں تو اب سرحدِ امکاں سے گذر جاؤں گا
تم کہاں پاؤ گے اے ڈھونڈنے والو! مجھ کو

○

یہ تو سچ ہے کہ اسے پیار نہیں تھا یارو!
میں بھی کچھ ایسا وفادار نہیں تھا یارو!

جانے کس طرح وہ میرے درِ دل تک آیا
ذہن اس کے لیے تیّار نہیں تھا یارو!

وہ مری آنکھ میں جلتا رہا تارے کی طرح
وقت ہر چند خوش آثار نہیں تھا یارو!

جانے کیوں پاؤں مرے سچ کی طرف اُٹھ نہ سکے
راستہ اتنا بھی دشوار نہیں تھا یارو!

آخرِ عمر میں اب جھوٹ بھی کیا کہنا ہے
میں محبّت کا سزاوار نہیں تھا یارو!

○

شب کا افسانۂ بے باک بیاں ہو یارو!
میں ہوں مرحوم ، مگر تم تو جواں ہو یارو!

کل تلک شور تھا محفل میں کہ ہم اپنے ہیں
آج آواز تو دو مجھ کو ، کہاں ہو یارو!

بے تعلّق تو نہ تھے اتنے ، سحر سے پہلے
چاند ڈوبا ، تو یہاں ہو نہ وہاں ہو یارو!

میں نے ماضی کے دَرو بام سجا رکھّے ہیں
لے کے فردا کو چلے آؤ ، جہاں ہو یارو!

خود شناسی کے لیے کوئی بہانہ ، حیلہ
یہ بھی جینا ہے؟ یقیں ہو ، نہ گماں ہو ، یارو!

آؤ ، توڑیں تو کسی طرح سکوتِ امروز
نغمۂ دوش کہ فردا کی فغاں ہو یارو!

عُمر تھوڑی جو بچی ہے وہ گناہوں میں کٹے
ہاتھ میں جام ہو اور کوئے بُتاں ہو یارو!

○

برقِ سحر کی زد پر ہے دل کا آشیانہ
اے شبنمی دھندلکو! اس نور سے بچانا

سائے میں زلفِ غم کے آرام کر رہا ہوں
تو کس کو ڈھونڈتی ہے اے گردشِ زمانہ!

اب فکر ہے اگر تو ہے تیرے گلستاں کی
ورنہ جلا چکے ہیں ہم اپنا آشیانہ

جب ساز بج رہا تھا، جب پھول کھِل رہے تھے
تھا اپنی زندگی میں ایسا بھی اک زمانہ

احساس مر چکا جب، پھر رنج کیا خوشی کیا
اب نغمۂ سحر ہو یا نالۂ شبانہ

○

جب سر پہ آپڑے گی تو غیرت بھی آئے گی
دستار گر گئی تو شرافت بھی آئے گی

تیشہ اُٹھالیا ہے تواب جو بھی زد میں آئے
اِس راستے میں، تیری عمارت بھی آئے گی

ایسا بھی کیا کہ کوئی خریدار ہی نہ ہو
جب بیچنے چلیں گے تو قیمت بھی آئے گی

ہوتا ہے بار بار رَوابط کا امتحاں
اِس آئینے میں گردِ کدورت بھی آئے گی

یہ دَورِ اختلاف بہت دیر پا نہیں
میری طرف وہ چشمِ عنایت بھی آئے گی

دیکھا ہے ایک شخص دریچے کے آس پاس
اُس گھر سے اب ہوائے نفاست بھی آئے گی

ہونٹوں کی نرم گرم دوا پیجئے امامؔ!
بجھتے ہوئے بدن میں حرارت بھی آئے گی

○

اجنبی نگاہوں میں جب خلوص پائے گی
بے نشاں سرابوں میں عُمر لوٹ جائے گی

ساحلِ تمنّا پر نیند اُڑ گئی سب کی
اب وہ موج کس کس کو گود میں سُلائے گی!

جسم کے سمندر میں ڈوبنا تو آساں ہے
رُوح کے جزیرے تک کس کی ناؤ آئے گی!

دوستوں سے کیا کہنا، اپنے دل کو سمجھالیں:
صبح ہو نہ ہو لیکن رات بیت جائے گی!

یوں مجھے نہ طعنے دو، دیکھنا تھکن میری
تیز رَو زمانے کے ساتھ ساتھ جائے گی

○

شاعری سحرِ نظر کیا ہوتی
مرہمِ زخمِ جگر کیا ہوتی

اپنا ہی غم تھا زمانے سے سوا
آپ کے غم کی خبر کیا ہوتی

رات اُٹھنے کو رضا مند نہ تھی
مسند افروزِ سحر کیا ہوتی

تیری دہلیز پہ تھک کر بیٹھی
منزلِ گردِ سفر کیا ہوتی

تاج و اورنگ کی اس دنیا میں
قدرِ اربابِ ہنر کیا ہوتی

جمع ہم نے کیے تنکے، ورنہ
قیمتِ برق و شرر کیا ہوتی!

○

کس سمت جا رہا ہے زمانہ ، کہا نہ جائے
اکتا گئے ہیں لوگ ، فسانہ کہا نہ جائے

اپنا مکاں اُجاڑ کے ، صحراؤں کی طرف
وہ شخص کیوں ہوا ہے روانہ ، کہا نہ جائے

لمحوں کی طرح گذری ہیں صدیاں تو بارہا
اِک پل بنا ہے کیسے زمانہ ، کہا نہ جائے

شُعلے بنے ہیں لفظ تو کانٹا ہوئی زباں
اب کیا کریں جو تیرا فسانہ کہا نہ جائے

ہے آنکھ اُفق پہ برف کی صورت جمی ہوئی
شب ہوگی کب سحر کا نشانہ ، کہا نہ جائے

کہنے کو یہ غزل ہے ، مگر کیا غزل ! جسے
نوحہ کہا نہ جائے ، ترانہ کہا نہ جائے

○

بے چہرہ منظروں کو بھی کچھ خدّو خال دے
اِس تیز روشنی میں اندھیرا اُچھال دے

ایسا نہ ہو کہ ظاہر و باطن کھنگال دے
ہر صاحبِ نگاہ کی آنکھیں نکال دے

بے رنگ ساعتوں کو فسونِ جمال دے
ان کو بھی اپنے جسم کے سانچے میں ڈھال دے

قید تکلفات سے باہر نکل کے آ
ہر واہمہ دماغ سے اپنے نکال دے

شاید فراز کوہ سے آئے کوئی جواب
لب بستہ وادیوں کو متاع سوال دے

گرنے نہ پائے نقد کا معیار سطح سے
وہ بے مثال ہے تو ہماری مثال دے

لفظوں کی تیز دھوپ میں یہ بھی جھلس نہ جائے
فکرِ برہنہ جسم پہ چادر ہی ڈال دے

دیواریں ہل رہی ہیں زمان و مکان کی
گرتا ہوا یہ گھر کوئی آکر سنبھال دے

○

وہ روشنی ہے کہ آنکھوں کو کچھ سُجھائی نہ دے
سکوت وہ ، کہ دھماکہ بھی اب سُنائی نہ دے

پہنچ گیا ہوں زمان و مکاں کے ملبے تک
مری انا ! مجھے الزامِ نارسائی نہ دے

اگر کہیں ہے تو دل چیر کر دکھا مجھ کو
تو اپنی ذات کا عرفان دے ، خُدائی نہ دے

ازل کے ٹوٹتے رِشتوں کی اس کشاکش میں
پُکار ایسی ادا سے ، مجھے سُنائی نہ دے

نکل چکا ہوں میں اپنی کمان سے آگے
تعلّقاتِ گذشتہ کی اب دُہائی نہ دے

○

قطعہ

پسِ دیوار بلکتے رہیے　　سر کو پتھر پہ پٹکتے رہیے
جرأت عرض تمنّا کیجے　　ورنہ شعلوں میں دہکتے رہیے
لوگ آغوشِ وفا تک پہنچے　　آپ شرماتے، جھجکتے رہیے

○

راستوں نے یہ کہا ہے ہم سے　　کچھ دنوں اور بھٹکتے رہیے
میری یادوں کے اُفق پر تا دیر　　صورتِ مہر چمکتے رہیے
میرے افکار کے ویرانے میں　　پھول کی طرح مہکتے رہیے
اپنے غم خانے میں ظلمت ہی سہی　　چاند کی سمت ہمکتے رہیے
نیند آئے کہ نہ آئے شب غم　　کم سے کم آنکھ جھپکتے رہیے
کیا پتہ کب کوئی خورشید اُبھرے　　بادلوں کو یونہی تکتے رہیے

فن ہو مجروح نہ چیخوں سے امامؔ!
ہاں، اسی طرح سسکتے رہیے

○

ساتھ بہتے ہوئے دھارے کے نہیں بہہ سکتے
میرؔ کے رنگ میں ہم شعر نہیں کہہ سکتے

دشتِ احساس کی زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم کسی شہر میں آزاد نہیں رہ سکتے

نبضِ لمحات میں تھوڑی سی دھمک باقی ہے
ہم ابھی لاش کو بھی لاش نہیں کہہ سکتے

ہم سے کہتے ہیں کہ پتّھر کا جگر چیر کے لاؤ
پھول کی چوٹ بھی جو دل پہ نہیں سہہ سکتے

دَور جمہور میں ہر اِک برابر حق ہے
ہم تری بزم میں تا دیر نہیں رہ سکتے

جانتے ہم بھی ہیں کیا چیز ہیں احبابِ عزیز
لیکن افسوس سرِ عام نہیں کہہ سکتے

کیا گلستاں کو نکھاریں گے نقیبانِ بہار
اپنے کمرے میں سلیقے سے نہیں رہ سکتے!

شان سے چھاپتے ہیں جن کو مدیرانِ شہیر
کاش ہم ایک بھی ویسی ہی غزل کہہ سکتے

○

پیشانی پر چاند لیے کون اُبھرا آدھی رات گئے
خون رگوں میں چہکا، بچھرا، چمکا آدھی رات گئے

سر کو پٹکتا تھا ساحل پر دریا آدھی رات گئے
سورج چاند سے ٹکّر لینے نکلا آدھی رات گئے

سارے بلب بُجھے تھے لیکن سارا کمرہ روشن تھا
لمحہ چلتے چلتے ٹھٹکا، ٹھہرا آدھی رات گئے

دَرد کا بھولا بھالا چہرہ، جاگا سا، کچھ سویا سا
کیا بتلاؤں میں نے کیا کیا دیکھا آدھی رات گئے

ایک نویلی دُلہن بن کر اک دن اندر آیا تھا
جانے کب کا بھُولا بھٹکا لمحہ آدھی رات گئے

ایسے بھی دن آتے ہیں جب سانسوں کا دَم گھُٹتا ہے
جاگا کرتی ہے جب ساری دُنیا آدھی رات گئے

باہر آکر دیکھا تو شب پتھر بن کر سوئی تھی
میں جب اپنے خوابوں سے اُکتایا آدھی رات گئے

○

منجمد آنکھ دہکتا ہوا شعلہ مانگے
زندگی مجھ سے مری عُمرِ گذشتہ مانگے

چاند نکلا ہے، کوئی زینتِ آغوش بھی ہو
سانس کا قُلزمِ بے تاب جزیرہ مانگے

کون شیشوں کو چُنے! کون دلوں کو جوڑے!
دل وہ کافر ہے کہ پھر ایک شوالہ مانگے

تمُ ہی آجاؤ ذرا ہاتھ میں پتّھر لے کر
آئینہ اب مرا کھویا ہوا چہرہ مانگے

جم چکی برَف زدہ منہ میں زباں، دیر ہوئی
حرفِ ناگفتہ اب ابلاغ کا شعلہ مانگے

اُس صنم نے تو رفاقت ہی طلب کی تھی امام!
ہر خذف ریزہ اب اپنے لیے سجدہ مانگے

○

یہ کڑا وقت گزارا کس نے
موسم ہجر سنوارا کس نے

پا شکستہ تھے ، سفر جاری تھا
تم سے مانگا تھا سہارا کس نے

شام کا کون شناسا نکلا
دن ڈھلے ہم کو پکارا کس نے

ہونٹ کس کے تھے مرے ہونٹوں پر
وقت کا زہر اُتارا کس نے

اُس کو اِس درجہ تعلق تو نہ تھا
حال پوچھا ہے دوبارہ کس نے!

آسمانوں پہ نظر رکھتے تھے
بام سے ہم کو اُتارا کس نے

کس کو طوفان کا اندازہ تھا
کرلیا مجھ سے کنارا کس نے

وقت چڑھتا ہوا دریا تھا امامؔ!
آپ کو پار اُتارا کس نے؟

○

آمام اب بھی پیاسا ہے کس واسطے
پہاڑی کا جھرنا ہے کس واسطے

نہ میرے لیے ہے نہ تیرے لیے
تو سارا اثاثہ ہے کس واسطے

یہاں تو جُنوں کی مہک ہی نہیں
یہ محمل کا پردہ ہے کس واسطے

نہ ذوق وفا ہے نہ شوق جفا
تو پھر تیرا چرچا ہے کس واسطے

نتیجہ اگر ڈھیر مٹّی کا ہے
بدن کا تقاضہ ہے کس واسطے

خوشی سانپ بن کر نہ بیٹھے اگر
تو غم کا دفینہ ہے کس واسطے

سمندر ہے گر زور آور بہت
تو پھر یہ جزیرہ ہے کس واسطے

"تماشا دکھا کر مداری گیا"
تو پھر یہ تماشا ہے کس واسطے

○

دل سے محو ہوئے جاتے ہیں غالب کے کلکتے والے
گوہاٹی میں ہم نے دیکھے ایسے ایسے چہرے والے

موسم رنگ بدلتا ہے جب، وہ بھی کچھ سے کچھ ہوتے ہیں
آج بڑے بے باک ہوئے ہیں کل شب کے شرمانے والے

جب سے مری آواز کو تم نے اپنے ہونٹوں سے چُوما ہے
مُنہ کو تلخ کیے پھرتے ہیں سارے شہد چُرانے والے

تپتی ریت پہ چلتے چلتے ایک ذرا سی چھاؤں ملی ہے
اس کے بھی حقدار ہوئے ہیں سارے رشتے ناتے والے

شب کی اُبھری خشک رگوں میں اب تو لہو تک سوکھ چکا ہے
لاؤ، بلاؤ آج کہاں ہیں صبح کی مے چھلکانے والے

ہم نے سُنا ہے دھوپ کڑی ہے، راہ میں موت بھی آجاتی ہے
جانے لوٹ کے کب آئیں گے دُور سفر پر جانے والے

○

نیند گہری تھی ، مگر چونک کے بیدار ہوئے
کن ہواؤں نے پکارا تھا کہ ہشیار ہوئے!

دشت میں تھے تو یہ زنجیر ملاقات نہ تھی
ہم ترے شہر میں پہنچے تو گرفتار ہوئے

اپنی ناکردہ گناہی نے وہ شہرت بخشی
ہم نمائش میں لگایا ہوا بازار ہوئے

جگمگاتی تھی جہاں سنگِ ملامت کی دُکاں
اُسی بازار میں ہم تیرے خریدار ہوئے

سامنے ، جوش میں تھے آگ لگانے والے
اپنا گھر دیکھ کے ، ہم اُن کے طرف دار ہوئے

○

اپنی دیوارِ انا کا بھی سہارا نہ ہوئے
ہم پُجاری کے پُجاری رہے، دیوتا* نہ ہوئے

جانے کیا تھا کہ اُسی سمت لُٹائے گئے پھول
ورنہ ہونے کو تو ہم جیسے بھی کیا کیا نہ ہوئے

تیرے قصّے میں ابھی تک ہے بہارِ امروز
اور ہم گذرے ہوئے دور کا افسانہ ہوئے

وقت کا شور سدا روح کے ہمراہ رہا
ہم اکیلے بھی رہے، پر کبھی تنہا نہ ہوئے

کوئی دیوار تو حائل تھی کہ ہم تُم برسوں
ایک ہی گھر میں رہے، پھر بھی شناسا نہ ہوئے

خود پرستی نے سکھایا نہیں یکجا ہونا
ہائے وہ ذرّے جو ذرّے رہے، صحرا نہ ہوئے

اپنے ماضی ہی کو روتے رہے تا عُمر امامؔ
مرثیہ گو تو ہوئے، شاعرِ فردا نہ ہوئے

* یہاں عام بول چال کا تلفظ اختیار کیا گیا ہے۔

○

لبوں پہ عکسِ تبسم بھی، آنکھ تر بھی ہے
جو غم ملا ہے، فریبی بھی معتبر بھی ہے

جو اَب مُڑے، تو نگاہیں بھی نُور کھو دیں گی
کہ اپنی پُشت پہ گردِ پسِ سفر بھی ہے

نہ رکھ ہر اک سے توقّع کہ سر جھکا کے چلے
تری گلی ہی سہی، عام رہ گذر بھی ہے!

لہو کی شمع بچائے رہیں ہواؤں سے
شکستہ راہ بھی ہے، رات کا سفر بھی ہے

خوشی سے آگ لگاؤ کہ اِس محلّے میں
مرا مکاں ہی نہیں ہے، تمھارا گھر بھی ہے

○

تجھے بدنام کرنے پر تُلی ہے
گلی ہر راہ رَو کو ٹوکتی ہے

مرا قصّہ، مگر تجھ سے تہی ہے
تری باتوں میں کیا شائستگی ہے!

سکوتِ دشتِ بے خوابی میں پہروں
صدائے بربطِ شب گونجتی ہے

وہیں تک ہے کھنڈر کی آخری حد
جہاں تک چاندنی پھیلی ہوئی ہے

مری تخئیل کے افسردہ لب پر
وہ اپنے ہونٹ رکھ کر سو گئی ہے

○

چہرۂ مایوس پر بھی بانکپن آیا تو ہے
ہم کو ہر حالت میں جی لینے کا فن آیا تو ہے

اپنے ہونٹوں پر لیے لالہ رُخوں کی داستاں
شہر یاروں میں کوئی شعلہ دہن آیا تو ہے

جس سے وابستہ تھیں شامِ درد کی تنہائیاں
صبح کی صورت وہ سادہ پیرہن آیا تو ہے

کچھ خرد مندوں کی نکتہ چینیوں کے باوجود
میری طرزِ فکر میں دیوانہ پَن آیا تو ہے

مُندمل ہوتا ہے کب تک، دیکھیے، ناسورِ وقت
آج وہ نشتر زنِ زخمِ کہن آیا تو ہے

شکر کر اے زندگی! اِک کج کلاہِ بزمِ شوق
لے کے اپنی آرزوؤں کی تھکن آیا تو ہے

○

کئی دنوں سے مرے شہر میں یہ چرچا ہے
کوئی مسیح فلک سے اُترنے والا ہے

چراغ جلتا نہیں اور دُھواں نکلتا ہے
مرے مکان میں جو کچھ نہ ہو وہ تھوڑا ہے!

ہمیں خبر ہے کہ شیشہ گری کا فن کیا ہے
کہ ہم نے توڑ کے ذرّات کو بھی دیکھا ہے

سُنا ہے، موت نے کل رات خود کشی کر لی
نئے مریض سے کہہ دو: شگون اچّھا ہے

پھر اس کے بعد وہی حبس بے وجودی کا
مجھے جو نام ملا ہے، ہوا کا جھونکا ہے

○

ترے خیال پہ بیتے دنوں کی مالا ہے
مگر، وہ دَورِ قیامت، جو آنے والا ہے!

ہر ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
امیرِ وقت کا جو کام ہے، نرالا ہے

ابھی سے ٹوٹتے لمحوں کی گرد اُڑنے لگی
یہ راستہ تو بہت دُور جانے والا ہے

وہی تو ہیں کہ جنھیں بولنا نہ آتا تھا
یہ کون لوگ ہیں، اب جن کا بول بالا ہے!

اسی اُمید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں
کہ اُس پہاڑ سے آگے بہت اُجالا ہے!

اب اِس کے بعد کوئی سانحہ بھی کیا ہوگا!
مرے وجود کا یہ آخری سنبھالا ہے

۴

۱۹۴۳ء-۱۹۶۰ء

○

مجھے اسی نے تری انجمن میں پہنچایا
ہجوم یاس میں تیرا خیال کام آیا

اُفق پہ ذہن کے قوسِ قزح سی لہرائی
بہت دنوں پہ یکایک ترا خیال آیا

بہ وقتِ وعدہ، وہ اندازِ جُنبشِ مژگاں
مجھے تو جھوٹ کی معصومیت پہ پیار آیا

حیا ان آنکھوں میں کچھ اس طرح سمٹ آئی
میں اپنی جرات شوق طلب پہ شرمایا

ملی نہ تھاہ ابھی تک زمیں کے ذرّوں کی
فراز چرخ سے تاروں کے راز لے آیا

اماں ! دشتِ انا میں بڑا سہارا ہے
کسی حسیں کے سجل روپ کا گھنا سایہ

○

حُسن ہی حُسن کی تفسیر ہے ، معلوم نہ تھا
کائنات آپ کی تحریر ہے ، معلوم نہ تھا

آج دیکھی ہے تری یاد کی وسعت میں نے
زندگی اتنی ہمہ گیر ہے ، معلوم نہ تھا

خواب دیکھے تو بہت میں نے شبستانوں میں
تو مرے خوابوں کی تعبیر ہے ، معلوم نہ تھا

میں سمجھتا تھا جسے ماہِ تمنا کی کرن
مہر عارض ہی کی تنویر ہے ، معلوم نہ تھا

رات دیکھا جو تصوّر میں تجھے پیکر مہر
وہ حقیقت ہی کی تصویر ہے، معلوم نہ تھا

سُنتے آئے تھے کہ ہے روئے زمیں پر بھی بہشت
تو جہاں ہے، وہی کشمیر ہے، معلوم نہ تھا

میں کہ آزادیٔ احساس سمجھتا تھا جسے
اپنے ہی شوق کی زنجیر ہے، معلوم نہ تھا

میں تو بے تاب تھا سننے کے لئے نغمۂ دل
تیری آواز گلو گیر ہے، معلوم نہ تھا

زخم کچھ اور بھی گہرے ہوئے کل رات امامؔ!
دستِ مہتاب میں شمشیر ہے، معلوم نہ تھا

○

تو اپنے پھولوں کو سُرخ کر لے، سوال ہے تیری آبرو کا
قبول کر اے زمینِ گلشن! حقیر تحفہ مرے لہو کا

نگہ میں انداز سرکشی کا، خروش ہے دل میں آرزو کا
چلی ہے دریا سے لینے ٹکّر یہ حوصلہ دیکھو آبجو کا

سنا ہے ہم نے کہ غیر کے چاکِ پیرہن کو جو سی رہے تھے
ہوئے ہیں دامن سے اپنے غافل جو خود بھی محتاج ہے رفو کا

تمھاری محفل میں دیکھتے ہیں خوشی کو اس طرح غم کے مارے
نگاہِ حسرت سے جیسے نانِ جویں کو تکتا ہو کوئی بھوکا

تم اپنے سامانِ جنگ لاؤ، سنان و تیر و تفنگ لاؤ
میں جام و طاؤس و چنگ لاؤں مقابلہ ہے یہ دوبدو کا

○

کوسوں دور کنارا ہوگا کشتی ہوگی، دریا ہوگا

پاس تمھیں ہو، تم ہی بتاؤ کوئی مجھ سا تنہا ہوگا!

آؤ، اور قریب آجاؤ وقت بھی رستہ تکتا ہوگا

تم سے حسیں تو اور بھی ہوں گے لیکن کوئی تم سا ہوگا!

اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے ہم نے تم کو چاہا ہوگا

ہم نے گریباں چاک کیا تھا ہم کو ہی خود سینا ہوگا

جب ہم تیرا نام نہ لیں گے وہ بھی ایک زمانا ہوگا

وہ بھی ایک حقیقت ہوگی جس کا نام فسانہ ہوگا

کل کی فکر کہاں تک کیجے اور بُرا اب کتنا ہوگا!

ہاں، وہ اَنام اک رُسوا شاعر
تم نے اُس کو دیکھا ہوگا!

○

کل ملاقات پہ اے دیدۂ تر! کیا ہوگا
اب ہے یہ رنگ تو پھر رنگ دگر کیا ہوگا

غیریت جو سرِ محفل ہے وہ جانے سے رہی
ان کی خلوت سے بھی ہو آئیں مگر کیا ہوگا

آج کی رات خیالِ لبِ لعلیں ہی سہی
کس کو معلوم کہ کل رنگِ سحر کیا ہوگا

قدم اٹھتے ہیں تو پیچھے کی طرف اُٹھتے ہیں
یہ سفر ہے تو پھر انجام سفر کیا ہوگا

زندگی شورشِ طوفانِ حوادث ہے اماؔم!
میں کہ اک شمعِ سرراہ گذر، کیا ہوگا!

○

یہ کس نے حالِ غم اپنا سنایا!
زمانہ جس کو سُن کر مسکرایا

زمیں رُک سی گئی محور پہ اپنے
تصوّر کس کو میرے پاس لایا!

تھکن اپنی مٹا لیتی محبّت
اگر ملتا تری زلفوں کا سایہ

نگاہیں تیری کیا کچھ پوچھتی تھیں!
بڑی مشکل سے حالِ دل چھپایا

۱۹۴۳ء

○

اُن کو بھی میرا انتظار ہے آج
زندگی کتنی خوش گوار ہے آج!

غیر کا ذکر ناگوار ہے آج
آپ کو مجھ سے اتنا پیار ہے آج!

جانے کیا رنگِ ہجرِ یار ہے آج
دل مضطر کو کچھ قرار ہے آج

وقت ہے، عرض مدّعا کرلوں
آپ کو مجھ پہ اعتبار ہے آج

تجھ پہ اے جان آرزوئے حیات!
دولتِ آرزو نثار ہے آج

روح کے ساتھ جسم بھی ہے قریب
قسمتِ شوق سازگار ہے آج

عشق کی تیز گامیاں مت پوچھ
منزل حُسن بھی غبار ہے آج

چھو رہا ہوں میں سرحدِ تکمیل
مقصد زیست کامگار ہے آج

گاؤ مظہر امام! نغمے گاؤ
گلشنِ فکر میں بہار ہے آج

○

دل ہے ہجوم داغ محبّت سے لالہ زار
لو ، گلشن حیات میں آ ہی گئی بہار

مانا مِری نگاہ حیا آشنا نہ تھی
جلوے مگر حضور کے خود بھی تھے بے قرار

جب آپ خود ہی اپنی ادائیں نہ گن سکے
میں اپنے داغِ دل کا کروں کس طرح شمار

دامانِ چشمِ دوست کے سائے تلے بھی آج
دل کو نہ جانے کیوں کسی پہلو نہیں قرار

میری وفاؤں نے بھی پشیماں کیا مجھے
دیکھا انھیں جو اپنی جفاؤں پہ شرسار

تکمیل آرزو کا بہانہ بھی تھا عجیب
کچھ عشق سوگوار تھا، کچھ حُسن غم گسار

اب تو خیالِ ترکِ مراسم بھی جُرم ہے
دیکھا ہے میں نے حُسن کی آنکھوں کو اشکبار

دامن اُلجھ گیا تھا کبھی جن سے حُسن کا
اب تک کھٹک رہے ہیں مری روح میں وہ خار

روزِ ازل سے ترشئ حالات ہے نصیب
پھر بھی مئے حیات کا اُترا نہیں خمار

یادوں کو بھی نہ جائے اماں مل سکی کہیں
تھا دامنِ خیال کچھ اس طرح تار تار

انکار عشق کی مجھے جرأت کہاں امام!
دل نے بھی اعتراف کیا اس کا چند بار

○

کہکشاں کا سنگار ہیں ہم تم
چاندنی کا نکھار ہیں ہم تم

پھر سرِ آبشار ہیں ہم تم
میہمانِ بہار ہیں ہم تم

فطرت اک آئینہ دکھاتی ہے
اور آئینہ دار ہیں ہم تم

موسمِ گل کی لاج رکھ لیں گے
شکر ہے بادہ خوار ہیں ہم تم

اس کو نذرِ خزاں نہ ہونے دیں
چار دن کی بہار ہیں ہم تم

۱۹۴۳ء

○

کھیلتی ہے عارضِ گلگوں سے زلفِ عنبریں
کتنا لذّت آفریں ہے اتّصالِ کفر و دیں!

اپنی کہتی جا رہی ہے اور مری سُنتی نہیں
کس قدر بے باک ہے تیری نگاہِ شرمگیں

میرے خوابوں کی طرح شاداب کیوں ہوتی نہیں
میری کلیوں کی روش، میرے گُلوں کی سرزمیں

ہے یہی شہرِ نگاراں وصل و فُرقت کا دیار
میری دوزخ بھی یہیں ہے، میری جنّت بھی یہیں

○

گردش چشم کی تفسیر کروں یا نہ کروں
قصرِ اُمّید کی تعمیر کروں یا نہ کروں

کون جانے کہ سزا حسب طلب ہو کہ نہ ہو
جراتِ عرض کی تقصیر کروں یا نہ کروں

میری رُسوائی تو افسانہ در افسانہ ہے
آپ کے نام کے تشہیر کروں یا نہ کروں

شیخ صاحب کہیں شدّاد نہ ٹھہرائیں مجھے
جنّتِ شوق کی تعمیر کروں یا نہ کروں

کہیں برہم نہ ہوں وہ جن کو ہے ابہام عزیز
آیتِ عشق کی تفسیر کروں یا نہ کروں

مفتیِ دیں نہ کہیں کُفر کا فتویٰ دے دیں
اپنے جینے کی بھی تدبیر کروں یا نہ کروں

ڈر ہے مجروح نہ ہو جائیں روایات غزل
حُسن کے دل کو میں تسخیر کروں یا نہ کروں

○

یہاں پہ بیٹھ کے ہم کس کا انتظار کریں
کھلی زمیں ہے ، کوئی راہ اختیار کریں

جو اپنے دوست ہیں ، ان کا تو حال دیکھ چکے
اب اور کس کو غمِ دل کا راز دار کریں!

کسی طرح تو کٹے یہ گراں ، پہاڑ سی رات
چلو ، کہ آج کی شب ذکرِ حُسنِ یار کریں

کسی کی بزم میں گذرے ہوئے حسیں لمحو!
قریب آؤ ، کہ جی بھر کے تم کو پیار کریں

یہاں پہنچ کے کئی راستے نکلتے ہیں
کئی ہیں راہ نما ، کس کا اعتبار کریں!

یہی ہے رسمِ محبّت اگر تو ہم بھی امام!
جلائیں شمعِ وفا ، داغِ دل شمار کریں

○

تو کھو گئی ہے اے نگہ دیدہ ور ! کہاں؟
تیری خبر نہیں تو ہماری خبر کہاں!

اہلِ ہنر میں جُراتِ عرضِ ہنر بھی ہو
اس کے بغیر قدرِ متاعِ ہنر کہاں!

تم نے تو راستوں کے نشاں تک مٹا دیے
ہم لے کے جائیں اپنا مذاقِ سفر کہاں؟

کچھ تو بتاؤ آخر شب کے مسافرو!
ہوتا ہے ختم جادۂ نجمِ سحر کہاں؟

شب تو گذر رہی ہے حریمِ جمال میں
کیا جانے ہوگی صبح کہاں، دوپہر کہاں!

یہ کم نہیں کہ گردِ سفر ہے رفیقِ حال
اس راہ میں اماّم! کوئی ہم سفر کہاں!

○

نگاہِ دوست ذرا بے حجاب ہو تو کہوں
حدیثِ شوق ، وفا کامیاب ہو تو کہوں

بہت لذیذ حکایت ہے اپنے خوابوں کی
تری نگاہِ کرم کا جواب ہو تو کہوں

مری خرد نے تری بے رُخی سے کیا پایا
جنونِ عشق ذرا کامیاب ہو تو کہوں

رہِ حیات میں کس طرح پھول کِھلتے ہیں
ترا شباب مرا ہم رکاب ہو تو کہوں

چراغ آخر شب کا مآل کیا ہو گا
اگر حضور کو سننے کی تاب ہو تو کہوں!

تجھے امام کے رنگِ سخن سے نسبت ہے
رُخِ صبیح ترا بے نقاب ہو تو کہوں

○

جوئے کم مایہ کو بحرِ بیکراں سمجھا تھا میں
اپنے گھر کے صحن کو سارا جہاں سمجھا تھا میں

وہ بھی تیرے ساز کا ہی تھا سرود مضمحل
جس کو اپنے قلب محزوں کی فغاں سمجھا تھا میں

رہ گزر پر جابجا تھے اپنے ہی سجدوں کے داغ
اور انھیں کو تیرے قدموں کے نشاں سمجھا تھا میں

تھا تصوّر کے چراغ کشتہ کا وہ بھی دُھواں
جس کو اپنی سادگی سے آسماں سمجھا تھا میں

میرے صحرائے تخیّل کا وہ اک دیوانہ تھا
جس کو اپنا ہم صفیر و ہم زباں سمجھا تھا میں

ختم تھی بس ان کے اک سادہ اشارے پر امامؔ!
زندگی کو داستاں در داستاں سمجھا تھا میں

۱۹۴۳ء

○

کارِ دل کو خوبصورت مشغلہ سمجھا تھا میں
کیا سمجھنا چاہیے تھا اور کیا سمجھا تھا میں!

مجھ کو زہر طعنہ احباب بھی پینا پڑا
اس نگاہِ مہر کو آبِ بقا سمجھا تھا میں

حُسن کی مجبوریاں بھی رفتہ رفتہ کھُل گئیں
بے رُخیٔ حُسن کو حُسنِ ادا سمجھا تھا میں

رہنماؤں نے اسی پر منزلیں تعمیر کیں
جس کو اپنی گمرہی کا نقشِ پا سمجھا تھا میں

وہ بھی اخلاق و شرافت ہی کی نکلی ایک شکل
جس کو اپنی بدمذاقی سے ریا سمجھا تھا میں

شیخ کی غیبت نہ کیجے حضرتِ مظہر امام!
نام سے تو آپ کو بھی پارسا سمجھا تھا میں

○

شب فراق کی حد سے گزر چکا ہوں میں
نگارِ صبح کے رخسار چومتا ہوں میں

ہمیشہ وقت کے سینے میں گونجتا ہوں میں
لبِ حیات سے نکلی ہوئی صدا ہوں میں

ذرا سا چھیڑ تو دے زخمۂ بہار مجھے
ربابِ لالہ و نسریں کا زمزمہ ہوں میں

فرازِ دار کو بخشی ہے میں نے رنگینی
کفِ حیات سے لپٹی ہوئی حنا ہوں میں

انھیں یہ زعم کہ کشتی کے ناخدا ہیں وہ
مجھے یہ ناز کہ ساحل کا مدّعا ہوں میں

خرد نصیب ! نہ کر طنز میری شورش پر
جنونِ عشق کے آداب جانتا ہوں میں

ہزار بار مرے پاؤں لڑکھڑائے ہیں
ہزار بار نئے عزم سے چلا ہوں میں

○

ہو گئی بت شکنی عام صنم خانوں میں
ایک کہرام ہے کعبے کے نگہبانوں میں

نام میرا بھی ہے ان سوختہ سامانوں میں
تذکرے جن کے ہوا کرتے ہیں ایوانوں میں

سوچتا ہوں تو حقیقت کا گماں ہوتا ہے
جانے کیا بات ہے احباب کے افسانوں میں

جتنے دیوانے ہیں شہروں میں نکل آئے ہیں
اہل دانش نظر آتے ہیں بیابانوں میں

جن کی تعبیر نہ تھی حسرت و وحشت کے سوا
خواب دیکھے گئے ایسے بھی شبستانوں میں

یوں تو ہونے کو فرشتے بھی ہیں، شیطاں بھی ہیں
کاش ہوتا کوئی انسان بھی انسانوں میں

اپنی ہی طرح سمجھتے ہیں مجھے بھی احباب
عقل کا شائبہ ملتا نہیں فرزانوں میں

جن کی ایک ایک ادا حُسن قبائے تہذیب
ایسے کچھ لوگ بھی ہیں چاک گریبانوں میں

غور سے دیکھ تو سائے بھی نظر آئیں گے
میرے احساس کے تپتے ہوئے میدانوں میں

مشترک سوز محبّت ہے بڑی چیز امام!
کچھ رقابت نظر آتی نہیں پروانوں میں

○

میرا فن، میری غزل، تیرا اشارا تو نہیں
حُسن تیرا اسی پردے میں خود آرا تو نہیں؟

دم ظلمت بھی جو آنکھوں میں ہے تصویرِ سحر
ہاتھ کچھ اس میں بھی اے دوست! تمھارا تو نہیں؟

کاکلِ وقت میں سلجھاؤ نظر آتا ہے
آپ نے زلف پریشاں کو سنوارا تو نہیں؟

میرے احساس کی وادی میں شفق سی جھلکی
مجھ کو دوشیزۂ فطرت نے پکارا تو نہیں!

دامنِ حُسن سے کچھ اور سلگ اُٹھتی ہے
عشق کی آنکھ میں شبنم بھی شرارا تو نہیں

مانتا ہوں کہ کنارے کی تمنّا ہے مجھے
میں نے طوفاں سے کیا پھر بھی کنارا تو نہیں

خون گلشن ہے پسِ پردۂ اعلان بہار
دیکھنا غنچۂ نورس میں شرارا تو نہیں!

پھر نئے سر سے پر و بال میں جنبش سی ہوئی
نرگسِ شاہد گل کا یہ اشارا تو نہیں؟

تھم گئی صوتِ جرس، رُک گئے رہبر کے قدم
کسی گم کردۂ منزل نے پکارا تو نہیں؟

میں نے مانا ترے کوچے میں قدم اُٹھ نہ سکے
زیست کی دوڑ میں لیکن کبھی ہارا تو نہیں!

○

اب بھی پردے ہیں وہی، پردہ دری تو دیکھو
عقل کا دعویٰ بالغ نظری تو دیکھو

سر پٹکتے ہیں کہ دیوار خُمستاں ڈھا دیں
حضرت شیخ کی آشفتہ سری تو دیکھو

آج ہر زخم کے منہ میں ہے زبان فریاد
میرے عیسیٰ کی ذرا چارہ گری تو دیکھو

قید نظارہ سے جلووں کو نکلنے نہ دیا
دوستوں کی یہ وسیع النظری تو دیکھو

ان سے پہلے ہی چلے آئے جنابِ ناصح
میرے نالوں کی ذرا زُود اثری تو دیکھو

ہے تغافل کہ توجہ ، نہیں کھُلنے پاتا
حُسنِ معصوم کی بیداد گری تو دیکھو

مجھ سے ہی پوچھ رہا ہے مری منزل کا پتہ
میرے رہبر کی ذرا راہ بری تو دیکھو

اُن کو دے آئے ہیں خود اپنی محبّت کے خطوط
غمگساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

دونوں ہی راہ میں ٹکراتے چلے جاتے ہیں
عشق اور عقل کی یہ ہم سفری تو دیکھو

جاوداں قُرب کے لمحات ہوئے ہیں مظہرؔ!
طائرِ وقت کی بے بال و پری تو دیکھو

○

مامور کیا ہے خدمت پر حالات نے اپنے شانے کو
اے زلفِ حیات! آزردہ نہ ہو آیا ہوں تجھے سلجھانے کو

اے لیلیٰ گیتی! اس پہ ہی افسانۂ وحشت ختم نہیں
کچھ دار و رسن سے بھی آگے جانا ہے ترے دیوانے کو

خود تیرے سنہرے شعلے میں ان دیکھے پتنگے پلتے ہیں
اے شمعِ وفا! تو جلتی جا، مت ڈھونڈ کسی پروانے کو

اس میں بھی نہاں ہیں سرو سمن، اس میں بھی رواں ہے روحِ چمن
تم موسم گل کی آنکھوں سے دیکھو تو ذرا ویرانے کو

ہے دخترِ رز کے عارض کی سرخی میں کہاں وہ کیف امام!
خود اپنے جگر کا خوں دے کر خوش رنگ کرو پیمانے کو

○

دردِ عالم بھی کہیں دردِ محبّت ہی نہ ہو
دل کے بہلانے کی یہ بھی کوئی صورت ہی نہ ہو

آج تزئینِ جمال ایک فسانہ ہی سہی
کل یہ مشاطگیٔ حُسن حقیقت ہی نہ ہو

اُن کی آنکھوں میں مچلتا ہے جو افسانۂ شوق
سوچتا ہوں کہیں وہ میری حکایت ہی نہ ہو

بے رُخی پر جسے محمول کیا کرتا ہوں
وہ بھی کچھ آپ کا اندازِ محبّت ہی نہ ہو

آج خود حُسن کو دیکھا ہے سرِ کوچۂ عشق
دیکھیں آغاز کوئی تازہ روایت ہی نہ ہو!

عقل بھی اب رسن ودار تک آ پہنچی ہے
طفلکِ شوق کی اک یہ بھی شرارت ہی نہ ہو

○

تری نگاہوں نے مجھ کو بخشا ہے ایسا انداز والہانہ
بدل دے جو زندگی کا محور، پلٹ دے جو گردشِ زمانہ

اگر توجہ ہے مخلصانہ تو ہے تجاہل بھی عارفانہ
ہوئی ہے ان کی نظر مسلماں، مگر بہ انداز کافرانہ

ابھی نگاہوں کی بے نیازی، ابھی اداؤں کی دلنوازی
یہ تیرا حُسن کرشمہ سازی، ابھی حقیقت، ابھی فسانہ

یہ شوق کا جذبۂ فراواں یہ میرے قلب و نظر کے طوفاں
ہوں تیرے دل میں اگر نہ مہماں، تو پھر ہو ان کا کہاں ٹھکانہ

نظر شرابی، ادا شرابی، جسے بھی دیکھا ہوا شرابی
وہ سر سے پا تک ہیں جان مستی، تمام ہستی شراب خانہ

حیات تو خیر تھی ہی نالاں، اجل بھی مجھ سے ہے اب گریزاں
نہ اِس کی آغوش میں ٹھکانہ، نہ اُس کی آغوش میں ٹھکانہ

جو دے اجازت امامؔ! ان کا جمال پروردۂ تبسّم
بناؤں برق الم کی زد پر میں آرزوں کا آشیانہ

۱۹۴۵ء

○

اشک بھی پیتے ہیں اکثر بادۂ گلفام بھی
ہم کہ ہیں آسودہ لب بھی اور تشنہ کام بھی

نالۂ قلب جرس بھی نغمۂ منزل بھی ہیں
خود ہمیں آغاز بھی ہیں، خود ہمیں انجام بھی

گو خرابِ گردشِ ایّام ہیں ہم ہی، مگر
ہیں ہمیں پر انحصارِ گردشِ ایّام بھی

بیٹھ کر صحنِ حرم ہیں ہم کبھی پیتے ہیں مے
باندھتے ہیں بادہ خانے میں کبھی احرام بھی

ہو رہا تھا کل تغافل کا بُتوں کے تذکرہ
لے گئے اس سلسلے میں ہم خدا کا نام بھی

ہم براہیمی میں بھی رکھتے ہیں شانِ آذری
بُت شکن ہوتے ہوئے ہیں خالقِ اصنام بھی

اک معمہ بن گیا ہے اپنی فطرت کا تضاد
ہیں ہمیں خود محتسب بھی، رند خم آشام بھی

ناقدِ رسمِ حرم ہیں، نام ہے گرچہ امام
نیک نامی میں ہوئے ہیں ہم بہت بدنام بھی

○

آرزوئے گل نے ایسی آگ بھڑکائی نہ تھی
یوں گلستاں میں کبھی پہلے بہار آئی نہ تھی

آج وہ سرکا رہے ہیں خود ہی چہرے سے نقاب
اُن میں پہلے یہ ادائے جلوہ فرمائی نہ تھی

رنگ رُخ سے اب جھلکتا ہے شہیدوں کا لہو
ایسی سُرخی اُن کے عارض پر کبھی آئی نہ تھی

آپ کے جلوؤں کی حسرت نے اسے رُسوا کیا
ورنہ چشمِ شوق پہلے ایسی ہرجائی نہ تھی

زندگی کو تھا نہ اپنی کج کلاہی کا غرور
آستانِ ناز پر جب تک جبیں سائی نہ تھی

بھر دیا ہے حُسن میری زندگی میں آپ نے
ورنہ مجھ میں پہلے یہ شانِ خود آرائی نہ تھی

لالہ گوں ترشے ہوئے ہونٹوں کا تحفہ ہے ایامؔ!
ورنہ پہلے میری غزلوں میں یہ صنّاعی* نہ تھی

* یہاں صوتی قافیے کو جائز رکھا گیا ہے۔

○

نگاہ دوست میں پہلی سی بے رُخی نہ رہی
بجھی تو شمعِ تمنّا، مگر بجھی نہ رہی

میں شکوہ سنج ستم ہی رہا تو میرا مزاج!
وگرنہ اُن کی عنایت میں کچھ کمی نہ رہی

مذاق حُسن نے وہ ذمہ داریاں بخشیں
کہ زندگی فقط اپنی ہی زندگی نہ رہی

عجب نگاہ کرم ہے، یقیں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے مجھ میں کسی بات کی کمی نہ رہی

ترا جمال نظر آفریں رہے اے دوست!
مری نگاہ کا کیا ہے، رہی رہی نہ رہی

○

ہوش اتنا دل وارفتہ کو آیا تو سہی
کھو دیا خود کو مگر آپ کو پایا تو سہی

ایک لمحے کی خوشی بھی کسے ہوتی ہے نصیب
میرے ویرانۂ دل میں کوئی آیا تو سہی

اس سے کیا بحث عنایت کی نظر ہو کہ نہ ہو
اپنی محفل میں مجھے تو نے بلایا تو سہی

کیا ہوا مجھ پہ اگر عقل کا الزام آیا
آپ کا راز کسی طرح چھُپایا تو سہی

یوں بھی ملتی ہے کسے جُرمِ محبّت کی سزا
میں نے فردوس کے بدلے تجھے پایا تو سہی

میرے روکے نہ رُکا وقت کا طوفاں، لیکن
اک دیا میں نے سرِ راہ جلایا تو سہی

ہائے، تیرے لب مایوس سے یہ بھی نہ ہوا
میں نے اک نغمۂ پُر درد ہی گایا تو سہی!

○

اپنے کھوئے ہوئے لمحات کو پایا تھا کبھی
میں نے کچھ وقت ترے ساتھ گذارا تھا کبھی

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

اب اگر اشک امنڈتے ہیں تو پی جاتا ہوں
حوصلہ آپ کے دامن نے بڑھایا تھا کبھی

اب اسی گیت کی لے سوچ رہی ہے دنیا
میں نے جو گیت تری بزم میں گایا تھا کبھی

میری اُلفت نے کیا غیر کو مائل ، ورنہ
میں تری انجمن ناز میں تنہا تھا کبھی

کردیا آپ کی قُربت نے بہت دور مجھے
آپ سے بُعد کا احساس نہ اتنا تھا کبھی

دوست ناداں ہوتو دشمن سے بُرا ہوتا ہے
مجھ کو اپنے دلِ ناداں پہ بھروسا تھا کبھی!

○

دلِ حزیں کو تمنّا ہے مسکرانے کی
یہ رُت خوشی کی ہے یا ریت ہے زمانے کی!

بنا گئیں اسے پیچیدہ نت نئی شرحیں
کھلی ہوئی تھی حقیقت مرے فسانے کی

حرم کے پاس پہنچتے ہی تھک کے بیٹھ گئے
وگرنہ راہ تو لی تھی شراب خانے کی

کسی کے سایۂ گیسو کی بات چھڑتی ہے
مرے قریب رہیں گردشیں زمانے کی

میں تیرے غم کا بھی تھوڑا سا جائزہ لے لوں
کبھی ملے مجھے فرصت جو مسکرانے کی

سمیٹ لیں مہ و خورشید روشنی اپنی
صلاحیت ہے زمیں میں بھی جگمگانے کی

بھلا امامِ تہجد گزار کیا جانیں!
کہ رات کتنی حسیں ہے شراب خانے کی

○

روح میں کہکشاں سی لہرائی — آج بے وقت کس کی یاد آئی!
جب کسی نے وفا کا نام لیا — بے ارادہ مجھے ہنسی آئی
شب کی پلکیں ہیں نیند سے بوجھل — غمِ دل لے رہا ہے انگڑائی
چند خوابوں کا تحفہ لایا ہوں — بخشیے عزّتِ پذیرائی
ہائے وہ چشمِ التفات آگیں! — پربتوں سے بلند ہے رائی
نام کس نے لیا محبت کا — بھولی بسری سی بات یاد آئی
رات کی گنگناتی خاموشی — تیری آواز بن کے لہرائی
ہے تصوّر میں اک خجل پیکر — رنگ لائی ہے ناشکیبائی
رات کو دن بنائے رکھتی ہے — تیرے وعدوں کی کار فرمائی

آپ یونہی رہیں گے محوِ خرام
یوں ہی بجتی رہے گی شہنائی

۱۹۴۶ء

○

یاد میری وفا نہ آجائے پھر تمھیں چاہنا نہ آجائے

جانے کب زخمِ دل کا درماں ہو کہیں وقت دُعا نہ آجائے

زندگی! دل کی کھڑکیاں مت کھول آرزو کی ہوا نہ آجائے

دُشمنی احتیاط سے کیجے دوستی کی ادا نہ آجائے

سونے والو! سحر سے پہلے ہی کچھ پیام صبا نہ آجائے

پینے والو! بہ قدر ظرف پیؤ زندگی کا نشہ نہ آجائے

جستجو میں ترے شبستاں کی اپنا ہی غم کدہ نہ آجائے!

آپ مجھ پر نگاہ مت کیجے آپ کو دیکھنا نہ آجائے

پُرسکوں دل ہے غم کے صحرا میں دوستوں کی صدا نہ آجائے

خوش گماں کیوں ہو اپنے فن پہ امام!
کہیں وہ خوش قبا نہ آجائے

○

خواب زاروں کی شفق ہو جیسے　　زیست پھولوں کا ورق ہو جیسے

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری　　کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے

صبح آنے کو تو آئی ہے، مگر　　چہرہ خورشید کا فق ہو جیسے

یوں اُمنڈ آتے ہیں الفاظ سے اشک　　سینہ جذبات کا شق ہو جیسے

آرزو شرح و بیاں سے محروم　　کوئی مضمونِ ادق ہو جیسے

پھر سے تجدید تعلق کی خلش　　اُس کی دل میں رمق ہو جیسے

بے سبب مجھ سے یہ خفگی، کیا خوب　　مجھ پہ کچھ آپ کا حق ہو جیسے

پردۂ ذہن پہ لہراتے خیال　　کوئی تابندہ اُفق* ہو جیسے

ظرف اتنا ہے تمنّا کا بلند　　آسماں ہی کا طبق ہو جیسے

تیرے اشعار کا یہ رنگ امامؔ!
ان کے ہونٹوں پہ شفق ہو جیسے

* میں اس تلفظ کو بھی درست سمجھتا ہوں۔

○

منزلوں کی دُھن میں دیوانے رہے
عقل والے چادریں تانے رہے

تشنگی ہی کو نہ جرات ہو سکی
دیر تک گردش میں پیمانے رہے

باغ میں اکثر بہار آتی رہی
پھول کی حسرت میں ویرانے رہے

رفتہ رفتہ ہم حقیقت بن گئے
آپ افسانے کے افسانے رہے

رشتۂ زنّار مستحکم ہوا
منتشر تسبیح کے دانے رہے

موسمِ گل میں یہ وضعِ احتیاط!
ہم بھی دیوانے کے دیوانے رہے

بت شکن آتے رہے، جاتے رہے
آدمی کے دل صنم خانے رہے

دوستوں کو دشمنی راس آ گئی
آپ اچھّے تھے کہ بیگانے رہے

ہو چکے دیر و حرم ویراں امامؔ!
شکر ہے آباد مے خانے رہے

○

پھر آپ نے دیکھا ہے محبّت کی نظر سے
گذرے نہ کہیں گردشِ دوراں بھی اِدھر سے

پوچھیں تو ذرا پیچ و خمِ راہ کی باتیں
کچھ لوگ ابھی لوٹ کے آئے ہیں سفر سے

شاید کہیں سورج کی کرن شام کو پھوٹے
ہم شمع جلائے ہوئے بیٹھے ہیں سحر سے

لوگو! مری آشفتہ سری پر نہ کرو طنز
الزام اُتارو کوئی اس زلف کے سر سے

دیکھا نہ اُنھیں دیدۂ حیرت نے دوبارہ
جلووں کو شکایت ہے مری تابِ نظر سے

خوشبوئے گل ولالہ چھپالیتے ہیں پتّے
اب قدر ہنر ہے تو فقط عرض ہنر سے

تارے تو چمک اپنی دکھاتے ہیں سحر تک
دل ڈوبنے لگتا ہے مگر پچھلے پہر سے

غیروں کی نگاہیں ترے جلووں سے ہیں سیراب
اے کاش! یہ بادل مری آنکھوں پہ بھی برسے

ظلمت ہی کے سائے میں سکوں ڈھونڈیے مظہرؔ!
خیرات بہت مانگ چکے نور سحر سے

○

آدابِ وفا سے واقف تھے، ہم جُراتِ بے جا کیوں کرتے
خاموشیٔ لب ہی کافی تھی، الفاظ کو رسوا کیوں کرتے

جب تیری تمنّا کر کے بھی جینے کی روش ویسی ہی رہی
اے جانِ تمنّا! تو ہی بتا، پھر اور تمنّا کیوں کرتے

لفظوں کو علامت کر بھی گئے اور بات بھی دل کی کہہ ڈالی
جو بات ادھوری ہی اچھّی، اس بات کو پورا کیوں کرتے

جب ہجر کی راتیں آتی تھیں، خوابوں کے کنول جل اٹھتے تھے
شبنم کی سی نرمی ہو جس میں اس آگ کو ٹھنڈا کیوں کرتے

زخموں ہی سے تازہ ہیں اب تک اِک دست حنائی کی یادیں
جو ٹیس بھی ہے وہ رنگیں ہے، اس رنگ کو پھیکا کیوں کرتے!

بس ایک تبسّم زیرِ لبی کیا دیدہ و دل کی قیمت تھی
ہر سانس میں تجھ کو پانا تھا، نقصان کا سودا کیوں کرتے!

O

انکسارِ انا کو کیا کہیے — دوستوں کی ادا کو کیا کہیے

شاخِ گل سے لپٹ کے روتی ہے — اس چمن کی ہوا کو کیا کہیے

بے قصوری کو اپنی کیا کیجے — اس نظامِ سزا کو کیا کہیے

بن گیا ان کی سُرخیِ عارض — خونِ عہدِ وفا کو کیا کہیے

راہزن کو بھی آرہا ہے حجاب — عشوۂ رہنما کو کیا کہیے

ہم چراغاں تو خیر کرلیں گے — تیرگیِ فضا کو کیا کہیے

شوق کو بھی جھجک سی ہوتی ہے — جلوۂ خودنما کو کیا کہیے

غیر تو خیر غیر ہیں ، لیکن — ہائے اس آشنا کو کیا کہیے

نبضِ کونین برق ساماں ہے — نغمۂ شعلہ زا کو کیا کہیے

اپنی رفتار بڑھتی جاتی ہے
منزلِ تیز پا کو کیا کہیے

○

اک گذارش ہے، بس اتنا کیجیے　　جب کبھی فرصت ہو، آیا کیجیے

لوگ اس کا بھی غلط مطلب نہ لیں　　اجنبیت سے نہ دیکھا کیجیے

خود کو اپنی آنکھ سے دیکھا تو ہے　　اب مری آنکھوں سے دیکھا کیجیے

التجا تھی، ایک سادہ التجا　　اپنی تنہائی میں سوچا کیجیے

یاد تو ہوگی وہ اپنی بے رُخی　　اب مری تصویر دیکھا کیجیے

مرہم زخم سخن بن جایئے　　کچھ مرے فن کا مداوا کیجیے

عشق کو کب یاد تھی رسمِ وفا؟　　حُسن کا کس منہ سے شکوا کیجیے

ظلمتِ غم جب زیادہ ہو اماؔم!
شمعِ فکر و فن جلایا کیجیے

○

دل نازک تک آنچ آئی ہے ‏ شعلۂ غم ! تری دُہائی ہے

میری صورت کو دیکھنے والے! ‏ یہ بھی اک طرز خود نمائی ہے

کچھ حسیں خواب اور کچھ آنسو ‏ زندگی کی یہی کمائی ہے

رشک کرتے ہیں جیتنے والے ‏ ہم نے اس طرح مات کھائی ہے

تیرگی کو بیاہنے کے لیے ‏ صبحِ نو کی برات آئی ہے

آؤ، محفل سے اُٹھ چلیں ہم لوگ ‏ وقت کی شمع جھلملائی ہے

"نالہ پابند نے" ہوا ہے اثام!

آہ مجبورِ نارسائی ہے

○

ہیں محوِ طرب، شدّت غم یوں تو بہت ہے
مے خوار ہیں ہم، جام میں سم یوں تو بہت ہے

اے کاش! ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر
آرام ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے

جانا کوئی مشکل بھی نہیں دار سے آگے
یہ فاصلۂ چند قدم یوں تو بہت ہے

ہے پیچ و خم راہ صنم خانہ بہ دستور
آرائش گیسوئے صنم یوں تو بہت ہے

تیری نگہ لطف بھی کچھ کم تو نہیں ہے
اے دوست! زمانے کا ستم یوں تو بہت ہے

مُنہ زور ہواؤں میں بھی رہ جائے تو جانیں
محفل کے چراغوں کا بھرم یوں تو بہت ہے

ہو آئیں امآم! آج ذرا اُن کی گلی سے
مشہور گلستانِ ارم یوں تو بہت ہے!

○

عشق کی قاہری بھی دیکھی ہے
حُسن کی بندگی بھی دیکھی ہے

موجزن جس میں خشک آنسو ہوں
میں نے ایسی ہنسی بھی دیکھی ہے

پاکیٔ گفتگو کے پردے میں
ذہن کی گندگی بھی دیکھی ہے

عشق کو بے نیاز پایا ہے
حُسن کی بے بسی بھی دیکھی ہے

جگمگاتے ہوئے خیالوں کی
اونگھتی تیرگی بھی دیکھی ہے

جس پہ احباب کا خلوص نثار
میں نے وہ دُشمنی بھی دیکھی ہے

گفتگو کا سکوت دیکھا ہے
بولتی خامشی بھی دیکھی ہے

جرم ہے جس کو زندگی کہنا
میں نے وہ زندگی بھی دیکھی ہے

○

زمانہ اب یہ کیسا آرہا ہے
کہ ہر بدمست سنبھلا جارہا ہے

جلاتی ہے خرد شمعوں پہ شمعیں
اندھیرا ہے کہ بڑھتا جارہا ہے

دعائیں کر رہے ہیں اہلِ ساحل
سفینہ ہے کہ ڈوبا جارہا ہے

مگر بڑھتی نہیں ہے بات آگے
زمانہ ہے کہ گذرا جارہا ہے

بھرا تھا رنگ جس خاکے میں برسوں
وہ خاکہ اِک بہ اِک دُھندلا رہا ہے

محبّت آپ ہی منزل ہے اپنی
نہ جانے حُسن کیوں اِترا رہا ہے

میں خود تصویر بنتا جارہا ہوں
تصوّر میں مرے کون آرہا ہے!

کسی سے پھر محبت ہو رہی ہے
مجھے پھر پیار دل پر آرہا ہے

نگاہ عشق کی وسعت نہ پوچھو
جہانِ حُسن سمٹا جارہا ہے

جدا اس کو نہ سمجھو کارواں سے
اَمامؔ اک بانکپن سے آرہا ہے

○

ہر لمحہ ایک خالِ رُخِ ماہ و سال ہے
کتنا حسیں تسلسلِ ماضی و حال ہے!

خود حُسن بھی رفیق ہے، آشفتہ حال ہے
اب جو مرا سوال ہے، اس کا سوال ہے

احسانِ التفات سے مجروح ہو گئی،
مغرور کس قدر مری چشم سوال ہے!

ساقی! شراب ناب کے چھینٹوں کو کیا ہوا؟
اب تک رُخِ حیات پہ گردِ ملال ہے

اے محوِ لطفِ خود نگری! تجھ کو کیا خبر؟
تیرا جمال میری نظر کا جمال ہے

یہ دورِ غم ہے تیرے تغافل کا آئینہ
شامِ فراق ہے نہ یہ صبحِ وصال ہے

○

شدّت غم میں مسرّت بھی گراں گذری ہے
خوگر رنج کو راحت بھی گراں گذری ہے

کبھی ہنگامۂ محفل سے ہوا ہوں بیزار
کبھی خاموشئ خلوت بھی گراں گذری ہے

جب بھی چھایا ہے تری شوخ نگاہی کا فسوں
چشم نرگس کی متانت بھی گراں گذری ہے

درد ہر دل کا مرے دل میں سمٹ آیا ہے
مجھ کو احساس کی دولت بھی گراں گذری ہے

جب بھی آیا ہے کسی کے دلِ نازک کا خیال
اپنی تاثیرِ محبّت بھی گراں گذری ہے

جب بھی پایا ہے اسے تیری اداؤں کی حریف
اپنی تخئیل کی ندرت بھی گراں گذری ہے

جب بھی پھوٹی ہیں ترے رنگِ قبا کی کرنیں
شوخیِ جلوۂ فطرت بھی گراں گذری ہے

زندگی خواب نہیں ، ایک حقیقت ہی سہی
مجھ کو اکثر یہ حقیقت بھی گراں گذری ہے

بارہا عشق میں ایسے بھی مقام آئے ہیں
جب تری چشمِ عنایت بھی گراں گذری ہے

کبھی اندازِ تغافل میں بھی لطف آیا ہے
اور کبھی طرزِ محبّت بھی گراں گذری ہے

دلِ خوددار کی ہے وضع نرالی اے دوست!
اپنے غم میں تری شرکت بھی گراں گذری ہے

کوچۂ دوست میں رکھتے نہیں جو پاس ادب
ایسے احباب کی وحشت بھی گراں گذری ہے

ہائے وہ دل کہ جسے ظلمت غم میں اکثر
تیرے عارض کی صباحت بھی گراں گذری ہے

دشمنو! کچھ مری رُسوائی کا سامان کرو
دوستوں کو مری شہرت بھی گراں گذری ہے

میں وہ خود بیں ہوں کہ ہوں اپنا رقیب آپ امامؔ!
اپنے اشعار کی شہرت بھی گراں گذری ہے

○

انکار میں اقرار کی بات آہی گئی ہے
باتوں میں غمِ یار کی بات آہی گئی ہے

آیا ہے کبھی ذکر اگر دار و رسن کا
گیسو و قدِ یار کی بات آہی گئی ہے

جب سُرخیِ گلشن کا کبھی ذکر ہوا ہے
تیرے لب و رخسار کی بات آہی گئی ہے

مل بیٹھے ہیں زنداں میں اگر شام کو احباب
تیرے در و دیوار کی بات آہی گئی ہے

آرائشِ عالم پہ کبھی بحث جو ٹھہری
اس گیسوئے خمدار کی بات آہی گئی ہے

بے مہریٔ احباب کی باتیں جو ہوئی ہیں
دلداریٔ اغیار کی بات آہی گئی ہے

چھیڑا ہے کوئی تلخ فسانہ جو کسی نے
شیرینیٔ گفتار کی بات آہی گئی ہے

ڈھونڈا ہے اگر زخمِ تمنّا نے مداوا
اک نرگسِ بیمار کی بات آہی گئی ہے

○

جو اب تک ناؤ یہ ڈوبی نہیں ہے		تو ساحل پر بھی بے چینی نہیں ہے
چلو، ہم بھی وفا سے باز آئے		محبّت کوئی مجبوری نہیں ہے
ذرا تاریکیوں کو بھی پکارو		کہ اتنی روشنی اچھّی نہیں ہے
ابھی سے کانپتا ہے شمع کا دل		ابھی اس نے نقاب الٹی نہیں ہے
رہا کرتی ہے حسرت بن کے دل میں		متاعِ آرزو لُٹتی نہیں ہے
حیات جاوداں پانے کی خاطر		حیاتِ مختصر چھوٹی نہیں ہے

امامؔ! آئیں ذرا اس بزم تک وہ
جنھیں احساسِ محرومی نہیں ہے

○

موج دریا بلا بھی ہوتی ہے　　اور یہی ناخدا بھی ہوتی ہے
تیرے در تک پہنچ گئے ہیں ہم　　گمرہی رہنما بھی ہوتی ہے
حُسن جب بے نیاز ہوتا ہے　　اس میں اک التجا بھی ہوتی ہے
جب کوئی ماہ رو نہیں ہوتا　　چاندنی ناروا بھی ہوتی ہے
ہر مرض کی دوا محبّت ہے　　اور یہی لا دوا بھی ہوتی ہے
عشق کا یہ غرور بھی ٹوٹا　　حُسن سے اب وفا بھی ہوتی ہے
مے کشی قید وقت میں نہ رہی　　یہ نماز اب قضا بھی ہوتی ہے
دوستو! اب سحر کو دو آواز　　شب کی اک انتہا بھی ہوتی ہے

ہے غمِ دل کا شکر، ورنہ امامؔ!
شاعری بے مزہ بھی ہوتی ہے

آزاد غزل

۱۹۴۵ء - ۱۹۹۳ء

○

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے، سفینا آپ ہیں

آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے اُفق پر جگمگایا جو ستارا، آپ ہیں

کیوں نگاہوں نے کیا ہے آپ ہی کا انتخاب
کیا زمانے بھر میں یکتا آپ ہیں!

میری منزل بے نشاں ہے، کس کو آئے گا یقیں!
میری ہی منزل کی جانب جادہ پیما آپ ہیں

ہائے وہ ایفائے وعدہ کی تحیّر خیزیاں
اُن کی آہٹ پر ہی گھر کا کونہ کونہ چیخ اُٹھّا تھا کہ "اچھّا آپ ہیں!"

۱۷ر فروری ۱۹۴۵ء

○

پھول ہو زہر میں ڈوبا ہوا، پتّھر نہ سہی
دوستو! میرا بھی حق کچھ تو ہے، چُھپ کر سہی، کُھل کر نہ سہی

پھر سوال آج یہی ہے کہ ملے بودھ کو کیسے نِروان
مسئلہ: زندگی و موت کا چکّر — نہ سہی

سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار بنے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ رہے، دَر نہ سہی، گھر نہ سہی

آ، مرے جسم تک آ، ابرِ طرح دار کی طرح
یہ تو معلوم ہے تو جھانک نہ پائے گی مری رُوح کے اندر، نہ سہی

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی، آپ کا پیکر نہ سہی

آج کے دَور میں یہ بھی ہے اِک احسان امام!
غم تو دے سکتے ہیں احباب کو ہم، دل نہ سہی، سر نہ سہی

۱۵ر فروری ۱۹۶۷ء

○

جن کے دل میں رخشندہ ہیں الہامی آیات
وقت کے بھاری شانوں پر وہ رکھ کر دیکھیں اپنا ہات

بیج نمک کے بونے والے کھیتی میں مصروف
اب کے جانے کب تک ٹھہرے زخموں کی برسات!

ہم کیا اُن کی نذر کریں اب، چہرے پر آنکھیں ہی نہیں
پہلے دے کر خوش ہوتے تھے اشکوں کی سوغات

صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اُڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات

"آج ہوا سو ہونا تھا (میں اُونچے گھر کی بیٹی ہوں!)
دیکھو پھر مت کرنا ایسی ویسی بات!"

کتنا گرم لہو ہے اپنا، دُنیا کو بھی دیکھنے دیں
رکھنا ہونٹ پہ ہونٹ اور دینا ہات میں ہات!

اپریل ۱۹۷۱ء

○

تو جو مائل بہ کرم تھا، تو زمانے کا مجھے ہوش نہیں رہتا تھا
میں، کہ خود سر تھا، ترے زیرِ نگیں رہتا تھا

شاخ در شاخ گُلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اِک پرندہ تھا، یہیں رہتا تھا

دل سے بے ساختہ بہتے ہوئے آنسو کا سفر آنکھ کی منزل سے پرے ختم ہوا
کون ویران مکاں دیکھ کے پوچھے کہ: "یہاں کوئی مکیں رہتا تھا؟"

خاک اُڑتی ہوئی دیکھی تو دِلوں کی یاد آئی
کیا یہاں کوئی حسیں رہتا تھا!

رات آنکھوں میں حیا لے کے گزر جاتی تھی
لمحۂ شوق بہت چیں بہ جبیں رہتا تھا

دُور سے دیکھ رہا ہوں میں اُجڑتی ہوئی بستی کا دُھواں
وہ اُسی جلتے ہوئے گاؤں کا باسی تھا، وہیں رہتا تھا

۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

○

اِسی سرمئی روشنی میں رواں دل کا ہارا ہوا کارواں ہے
چراغِ سحر میں دُھواں ہی دُھواں ہے

ملی ہے جو منزل، تو یہ لگ رہا ہے کہ سارا سفر رائگاں ہے
کہ اب سانس کا بوجھ ڈھونڈنا بھی جی کا زیاں ہے

مکیں ہیں نئے، اُن کی قدریں نئی ہیں
ستم آزمودہ گلی میں ابھی تک ہمارا پرانا مکاں ہے!

جسے ڈھونڈتا ہوں، وہ میرے ہی دل کے دریچے سے لگ کر کھڑا ہے
جسے پا چکا ہوں، کہاں ہے!

وہی نقشِ اوّل، وہی نقشِ ثانی
وہی نقشِ جاں ہے

جو تھے اپنے گفتار کی گُل فشانی پہ نازاں، وہ اپنی زباں کاٹتے ہیں
کیا ہے مجھے جس نے سرشارِ یاقوتِ لب، میرا عجزِ بیاں ہے

مِری آنکھ کا زاویہ میری فکر و نظر کو ابھی دائروں میں سمیٹے ہوئے ہے
نشست اپنی بدلوں تو دیکھوں: مِرے شوقِ آخر کی سرحد کہاں ہے!

۱۹۸۳ء

○

فن کے شیشے سے کوئی ہیرا تراشا بھی نہیں
پیکرِ اظہار رُسوا بھی نہیں

یوں اگر دیکھوں تو اس کا وعدۂ فردا فریب
اور یوں دیکھوں تو دھوکا بھی نہیں

تم اگر چاہو بنا لو میرے غم کو غازۂ رُخسارِ خواب
شوخ بھی اتنا نہیں یہ رنگ، پھیکا بھی نہیں

ساری دُنیا سے جدا، سارے زمانے سے الگ
اور اکیلا بھی نہیں

دیر سے بیٹھے ہیں رستے پر دُعا کو ہاتھ اُٹھائے
اس کی رحمت کا بھروسا بھی نہیں

اس قدر مسحور تھے حُسن بیاں سے، اس کے لفظوں کی طرف
ہم نے دیکھا بھی نہیں

ہم کو ہجرت راس آئی ہے، مگر
خاک سے اپنی بچھڑنا فائدے کا کوئی سودا بھی نہیں

۱۹۸۴ء

○

سب دُعائیں ہو چکیں، انجام درماں ہو چکا
اے چراغِ بے سحر! میرے لیے اِک لمحہ، آخر تو لا

گونجتی ہے ریت پر اب بھی صدائے نقشِ پا
کون تھا وہ اے سمندر کی ہوا!

میں، کہ اپنی بے اماں راتوں کا ہوں پروردگار
آ، تجھے بھی آزمالوں اے خدا!

اپنے اندر اب کوئی شعلہ اُبل پڑنے کو ہے
اے مصوّر! شب کے پس منظر میں کوئی آتشیں منظر دِکھا

اے مری محبوب مٹّی! میرے قدموں کو تقدّس بخش دے
پاؤں مَیں چھالے لیے تجھ تک میں واپس آگیا

۱۹۸۵ء

○

تجھ کو دیکھ کے سوچا کب تھا، ایسا بھی ہو جائے گا
بارش کا لہراتا پانی سوکھی ریت میں کھو جائے گا

جشن منانے والے چاہے نغموں کی لے تیز کریں
سونے والا سو جائے گا

بنجر کھیتوں میں اب کاشت کا موسم آئے نہ آئے
بونے والا تخمِ محبّت بو جائے گا

شام کے زینے پر اِک لمحہ تیری یاد کا ٹھٹکا ہے
پیاس بڑھے گی لیکن لب تو بھگو جائے گا

پیڑوں پر اب برف شگوفے کِھل جائیں گے
موسم اُجلا ہو جائے گا

پھیلا دیکھ کے خشک زمینوں کے آنچل کو
بادل کا اِک ننّھا ٹکڑا رو جائے گا

۱۹۸۸ء

○

جلوۂ دردِ نہاں کتنا تھا!
نفع نقصان میں کتنا تھا، زیاں کتنا تھا!

وہی دو گز کی سسکتی ہوئی تنہائی، وہی قہرِ سوال
خاک پر سلسلۂ حرف و بیاں کتنا تھا!

اُس کو دیکھا بھی نہیں آنکھ میں آنسو بھر آئے
محفلِ دل میں دُھواں کتنا تھا!

مجھ سے پوچھو کہ اُسے قسطوں میں مرتے ہوئے دیکھا میں نے
پارۂ رُوح کہاں کتنا تھا!

کون آیا تھا چُرانے مِرے ماضی کے کھنڈر
کل یہاں شورِ سگاں کتنا تھا!

کچھ کتابیں جو رہیں نام و نشاں سے محروم
حاصلِ عمرِ رواں کتنا تھا!

۱۹۹۲ء

○

سراسر اُس پہ تہمت ہے کہ اُس نے مجھ سے کچھ رشتہ نہیں رکّھا
جہاں کے کارِ غم بخشے، مجھے تنہا نہیں رکّھا

تمازت مہرِ امکاں کی کچھ اتنی خوش مروّت تھی
شجر ہم نے لگایا گھر کے آنگن میں، مگر سایہ نہیں رکّھا

رہیں بے خانماں سب نیکیاں اپنی
خدا نے میرے رستے میں کوئی دریا نہیں رکّھا

ہمیں سب رنگ اس کے زہر لگتے ہیں
زمانے کو شکایت ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں پر کوئی پردا نہیں رکّھا

سمندر سے گھبرانا بہت مشکل نہ تھا، لیکن
ہمیں نے اپنی کشتی کے جزیرے سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں رکّھا

نشے میں خوش گمانِ صبح تھے اتنے
کسی نے زخم شب پر آج تک پھاہا نہیں رکّھا

اِک انجانی صدا کانوں سے ٹکرائی
دیا لے کر چلے ہم، پھر خیال آیا کہ ہم نے گھر میں دروازہ نہیں رکّھا

۱۹۹۳ء

اشعار

○

تمھاری شب کا اُجالا تو سب نے دیکھا ہے
مِری سحر کے اندھیرے کو کون دیکھے گا!

○

بس ایک کام ہوا ہم سے زندگی میں امامؔ!
ایاغِ عمر شرابِ زیاں سے بھر لائے

○

کوئی چراغ، نہ رستہ، نہ نقشِ راہ رواں
مجھے پتہ ہے کہ میں کون سے سفر میں ہوں

○

قرار و قول کسی ہم زباں سے کرنا ہے
مجھے کلام اب آئندگاں سے کرنا ہے

○

تہمتیں سارے جہاں کی تیرے سر دھرنی پڑیں
تجھ سے ملنے کے لئے کیا سازشیں کرنی پڑیں

○

کیا خبر تھی کہ مجھے فن سے بھی پیارے ہوں گے
چند لمحے جو ترے ساتھ گزارے ہوں گے

○

کچھ دُور راستوں پر تارے بچھے ہوئے تھے
جب میں شکستہ پا تھے، تم بھی تھکے ہوئے تھے

○

زندگی یوں ہی نہیں گزری، ہمارا فن بھی تھا
کچھ تری قربت بھی تھی اور کچھ اکیلا پن بھی تھا

○

کچھ وقت ذرا اور بھی برباد کیا جائے
لمحات جو اچھے تھے انھیں یاد کیا جائے

○

اس شہرِ بے حیا میں جو آ ہی گئے ہیں ہم
چھینی ہوئی سروں سے ردا دیکھتے چلیں

جب جانبِ چراغ چلے ہیں تو اک نظر
کس سمت جا رہی ہے ہوا دیکھتے چلیں

○

یہ پوچھتا نہ پھرے سب سے پیاس کتنی ہے
یہ کام ابر کا ہے، دشت پر برس جائے

○

حروف پڑھ نہیں پاتے، کتاب مانگتے ہیں
یہ لوگ نیند سے پہلے ہی خواب مانگتے ہیں

○

ہوا بدن سے جدا سر، مرے بیان کے ساتھ
نتیجہ بھی نکل آیا ہے امتحان کے ساتھ

○

تمھاری راہ میں اِک ہم ہی ہم سفر تو نہ تھے
جو ساتھ چلتے تو کس کس کی بددعا لیتے!

○

لعل و گہر کی لوٹ میں احباب جمع تھے
ہم خار وخس بھی لائے تو اپنے مکاں سے لائے

○

کس سادگی سے میرا پتہ پوچھتے ہیں لوگ
اپنا مکان میں نے تو ڈھایا نہیں ابھی

○

بے ہنر ہوتے ہوئے ایک ہنر ہم نے کیا
گھر سے باہر نہ گئے اور سفر ہم نے کیا

○

بے لباسی ہو اگر اس کی تو آنکھوں کی بہار
پیڑ جب کپڑے اُتارے تو خزاں کہتے ہیں لوگ

○

شوقِ ہر رنگ کو بے باک بنائے رکھنا
دیدہ و دل کو ہوس ناک بنائے رکھنا

○

اپنے دل کی دھڑکن کو ہم کان لگا کر سنتے تھے
شہر میں جس دن برف گری تھی، دُور تلک سنّاٹا تھا

○

نہ جانے دوستوں کے خط کا کیوں ہے انتظار اتنا
مجھے معلوم ہے ان میں بری خبریں بھی ہوتی ہیں

○

جہاں امام کے اعزاز میں ہے جلسۂ عام
وہاں سے کوئے ملامت بھی کوئی دُور نہیں

○

لبِ مستقبلِ زرّیں پہ تبسم ہی سہی
دیدۂ حال میں جلتے ہوئے آنسو بھی تو دیکھ

○

عشق اپنے نیاز پر مغرور
حسن احساسِ کمتری کا شکار

○

ملنے کو ایک شخص سے ملتے ہیں آج بھی
لیکن کچھ اس طرح کہ کبھی دوستی نہ تھی

○

دل کے آنگن میں ہوئی جلوہ فشاں یوں تری یاد
جس طرح صحنِ چمن میں کوئی بارات آئے

○

اریبؔ* و انورؔ و مغنیؔ بڑھیں رفاقت کو
کہ بعدِ جامیؔ° و مخدومؔ شاذؔ• اکیلا ہے

۱۹۷۰ء

○

بس اتنا یاد ہے، اِک سانحہ سا گزرا تھا
نہ جانے کون برس، کون سا مہینا تھا

* سلیمان اریب، انور معظم، مغنی تبسم
° خورشید احمد جامی، مخدوم محی الدین
• شاذ تمکنت کا شعر ہے:
مخدومؔ و جامیؔ آہ کہاں جا کے کھو گئے — ارضِ دکن میں شاذؔ اکیلا دکھائی دے

○

برہنہ پشت پہ بارِ سفر اُٹھائے ہوئے
وہ کون تھا جو مرے ساتھ ساتھ چلتا تھا!

○

آپ، تنہائی، جوانی، موسم گل، چاند، رات
ایک مرکز پر سمٹ آئی ہے ساری کائنات

○

رقیب کو بھی گلے سے لگا لیا میں نے
تعلقات کو رسمی بنا لیا میں نے

چمک رہے ہیں کلس معبدِ محبت کے
تری نگاہ کا سونا چرا لیا میں نے

○

مدح خواں ہیں مرے ناواقفِ مفہومِ سخن
اس سے بڑھ کر مرے شعروں کا زیاں کیا ہوگا!

○

مُٹھیوں میں بھر بھر کر ریت کی طرح ہم بھی
بھیجتے ہیں چھپنے کو اپنی رائگاں غزلیں

○○